الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

ممکن دائرہ میں عمل کرنے والا پاتا ہے
ناممکن دائرہ میں عمل کرنے والا
پائے ہوئے کو بھی کھو دیتا ہے

MAKTABA AL-RISALA
1439 OCEAN AVE. # 4C
BROOKLYN, N. Y. 11230
TEL.: (718) 258-3435

جولائی ۱۹۹۲ شمارہ ۱۸۸

اردو

تذکیر القرآن جلد اول	175/-
تذکیر القرآن جلد دوم	175/-
اللہ اکبر	45/-
پیغمبر انقلاب	40/-
مذہب اور جدید چیلنج	
عظمتِ قرآن	30/-
عظمتِ اسلام	6/-
عظمتِ صحابہ	6/-
دینِ کامل	50/-
الاسلام	40/-
ظہورِ اسلام	40/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات	60/-
صراطِ مستقیم	40/-
خاتون اسلام	45/-
سوشلزم اور اسلام	40/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-
الربانیہ	40/-
کاروان ملت	45/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-
حدیثِ رسولؐ	35/-
ڈائری جلد اول	80/-
ڈائری جلد دوم	80/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)	80/-
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	80/-
میوات کا سفر	35/-
قیادت نامہ	20/-
راہ عمل	25/-
تعبیر کی غلطی	50/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-
اقوال حکمت	20/-

انوار حکمت	20/-
تعمیر کی طرف	
تبلیغی تحریک	20/-
تجدید دین	20/-
عقلیات اسلام	30/-
مذہب اور سائنس	20/-
قرآن کا مطلوب انسان	8/-
دین کیا ہے	5/-
اسلام دین فطرت	6/-
تعمیر ملت	6/-
تاریخ کا سبق	6/-
فسادات کا مسئلہ	5/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-
تعارفِ اسلام	5/-
اسلام پندرھویں صدی میں	5/-
راہیں بند نہیں	6/-
ایمانی طاقت	6/-
اتحاد ملت	6/-
سبق آموز واقعات	6/-
زلزلۂ قیامت	8/-
حقیقت کی تلاش	6/-
پیغمبر اسلام	5/-
آخری سفر	6/-
اسلامی دعوت	6/-
خدا اور انسان	6/-
حل یہاں ہے	10/-
سچا راستہ	5/-
دینی تعلیم	6/-
حیات طیبہ	6/-
باغ جنت	6/-
نار جہنم	6/-
خلیج ڈائری	10/-
رہنمائے حیات	6/-
شخصیاتِ اسلام	6/-
تعدد ازدواج	3/-

روشن مستقبل	6/-
صوم رمضان	6/-
علم کلام	
صداقتِ اسلام	
علماء اور دورِ جدید	
ہندستانی مسلمان	
سیرتِ رسولؐ	
عربی	
الاسلام یتحدی	
سقوط الماركسية	
حقيقة الحج	

آڈیو کیسٹ

A-1 حقیقتِ ایمان	25/-
A-2 حقیقتِ نماز	25/-
A-3 حقیقتِ روزہ	25/-
A-4 حقیقتِ زکوٰۃ	25/-
A-5 حقیقتِ حج	25/-
A-6 سنتِ رسولؐ	25/-
A-7 میدانِ عمل	25/-
A-8 پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
A-9 اسلامی دعوت	25/-
کے جدید امکانات	
A-10 اسلامی اخلاق	25/-
A-11 اتحادِ ملت	25/-
A-12 تعمیرِ ملت	25/-
A-13 نصیحتِ لقمان	25/-

ویڈیو کیسٹ

V-1 پیغمبر انقلاب	
V-2 اسلام داعی امن	
V-3 اسلام دور جدید کا خالق	
V-4 امت مسلم کے لیے نئے چیلنج	
V-5 اسلام اور سماجی انصاف	
V-6 اسلام اور دور حاضر	

od Arises	75/-
uhammad	75/-
ıe Prophet of	
evolution	
am As It Is	
od Oriented Life	
ords of the Prophet	40/-
roducing Islam	
ligion and Science	
bligh Movement	20/-
am the Voice	20/-
Human Nature	
am the Creator	50/-
Modern Age	
e Way to Find God	5/-
e Teachings of Islam	6/-
e Good Life	6/-
e Garden of Paradise	6/-
e Fire of Hell	6/-
an Know Thyself!	4/-
uhammad The Ideal	5/-
haracter	
cial Justice in Islam	6/-
lygamy in Islam	3/-
ords of Wisdom	

فائل الرسالہ اردو (مجلد)

76-77 سال	90/-
78	80/-
79	80/-
80	80/-
81	80/-
82	80/-
83	80/-
84	80/-
85	80/-
86	80/-
87	80/-
88	80/-
89	80/-
90	80/-
91	80/-

فائل الرسالہ انگریزی (مجلد)

84	80/-
85	80/-
86	80/-
87	80/-
88	80/-
89	80/-
90	80/-
91	80/-

فائل الرسالہ ہندی (مجلد)

90-91	85/-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جولائی ۱۹۹۲ شمارہ ۱۸۸

زندگی اور موت	۴	خدائی منصوبہ کے برخلاف	۱۸
دعا بھی عمل	۵	معرفتِ حق	۱۹
تعمیر کی طاقت	۶	دو لفظ	۲۰
قیمت ضروری	۷	یہ انسان	۲۱
درست حل	۸	تشکیلِ حیات	۲۲
ناامیدی	۹	اقدام، نتیجہ	۲۳
ایک واقعہ دو انجام	۱۰	تحریک کی مخالفت	۲۴
نکتہ آفرینی	۱۱	مخالفت بے اثر	۲۵
داعیانہ صبر	۱۲	نظریاتی خلا	۲۶
قرآنی طریقہ	۱۳	اپنا مسئلہ	۲۹
جنگ، امن	۱۴	مسئلہ کا حل	۳۰
جڑ کی بات	۱۵	ایک سفر	۳۲
عقل والے لوگ	۱۶	خبرنامہ اسلامی مرکز - ۸۱	۴۷
اس کا سبب	۱۷	ایجنسی الرسالہ	۵۰

AL-RISALA (URDU) Monthly
The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110013
Telephone: 611128, 697333; Fax: 91-11-3312601 (Attn: Tel. 697333)
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US$25 (Air Mail)

زندگی اور موت

موت زندگی کا خاتمہ نہیں، موت نئی زندگی کا آغاز ہے۔ موت کسی آدمی کے عرصۂ حیات کا سب سے زیادہ سنگین لمحہ ہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ آدمی اپنی زندگی کے نئے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے۔

موت کے دن آدمی اپنے دور عارضی سے نکل کر اپنے دور ابدی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ اپنے دور عمل کو پورا کر کے اپنے دور جزا میں قدم رکھتا ہے۔ موت سے پہلے آدمی ایک ایسی دنیا میں تھا جہاں حقیقتیں چھپی ہوئی ہیں، موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں ہوگا جہاں تمام حقیقتیں سورج اور چاند کی طرح ظاہر ہو کر سامنے آجائیں گی۔

موت سے پہلے معرفت کا امتحان ہے، موت کے بعد مشاہدہ کا تجربہ۔ موت سے پہلے کی زندگی میں آدمی کو اس آزمائش میں ڈالا گیا ہے کہ وہ دیکھے بغیر حقیقتوں کو مانے۔ جبر کے بغیر وہ اپنے آپ کو سچائی کے آگے جھکا دے۔ اس کے لیے مادی نفع نقصان کا مسئلہ نہ ہو تب بھی وہ خدا کی رہنمائی کو پوری طرح اختیار کرلے۔

یہ صورت حال موجودہ زندگی کو بے حد سنگین بنا دیتی ہے۔ کیوں کہ جو آدمی آج کی آزمائش میں پورا نہ اترے اس نے اپنے آپ کو ابدی ناکامی کے خطرہ میں مبتلا کر دیا۔

جو آدمی آنکھ اور دل اور دماغ رکھتے ہوئے آج حق کو نہ پہچانے وہ کل کی مستقل دنیا میں اپنے آپ کو اندھے اور بہرے انسان کی صورت میں پائے گا۔ جس آدمی کے سامنے سچائی ظاہر ہو مگر وہ اس کے اعتراف میں اپنی زبان نہ کھولے، وہ کل کی دنیا میں اس حال میں اٹھے گا کہ وہ گونگا اور حقیر بنا ہوا ہوگا اور کوئی تدبیر نہ ہوگی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اس حالت سے نکالے۔ جس آدمی نے اپنے زبان و قلم کو اس لیے استعمال کیا کہ وہ لوگوں کو حق سے دور کرے، وہ اگلی دنیا میں خدا کی قربت سے دور کر دیا جائے گا۔ اس کو پھر کبھی یہ سعادت حاصل نہ ہوگی کہ وہ اپنے رب کا دیدار کرے اور خدا سے قریب ہونے کی خوشی اور ٹھنڈک حاصل کر سکے۔

موت نام ہے ـــــ ایک مرحلۂ حیات سے نکل کر دوسرے مرحلۂ حیات میں داخل ہونے کا۔

دعا بھی عمل

ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ مکی دور میں قبیلہ دوس کے ایک شخص طفیل بن عمرو الدوسی آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے آپ سے قرآن کو سنا اور پھر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپ کی اجازت سے وہ اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور ان کو اسلام کی طرف بلانا شروع کیا مگر قبیلہ کے لوگوں نے انکار اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ طفیل بن عمرو دوبارہ آپ کے پاس آئے اور کہا کہ قبیلہ دوس کے لوگ حق کے معاملہ میں سرکشی کر رہے ہیں۔ آپ ان کے خلاف بد دعا کیجئے۔ آپ نے اس کے برعکس ہاتھ اٹھایا اور ان کے حق میں دعا کرنا شروع کیا: اے اللہ، تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے، اے اللہ تو قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔ پھر آپ نے طفیل بن عمرو سے کہا کہ اپنے قبیلہ کی طرف واپس جاؤ اور اس کو دوبارہ دعوت دو۔ اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرو (سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۴۰۹)

یہ دعا اور یہ نصیحت کوئی سادہ سی بات نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپ نے طفیل بن عمرو کو منفی نفسیات سے نکال کر مثبت نفسیات کی طرف موڑ دیا۔ جن لوگوں کے بارے میں ان کے اندر بیزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا ان کے لیے ان کے اندر خیر خواہی کا جذبہ بیدار کر دیا۔ جس معاملہ میں طفیل بن عمرو صرف حال کو دیکھ رہے تھے۔ اس معاملہ میں آپ نے ان کے اندر مستقبل کو دیکھنے کی نظر پیدا کر دی۔

دعا ایک اعتبار سے خدا سے مانگنا ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے وہ اپنی نفسیات کی صالح تربیت ہے۔ وہ اپنے اندر ربانی طاقت کو بیدار کرنا ہے۔ طفیل بن عمرو جب اس نئی نفسیات کے ساتھ دوبارہ اپنے قبیلہ میں گئے تو وہ گویا ایک نئے انسان بن چکے تھے۔ اب وہ اس قابل تھے کہ زیادہ موثر انداز میں حق کی دعوت ان لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس کے بعد نتیجہ ظاہر تھا۔ پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا۔

جس سوسائٹی میں لوگ ایک دوسرے کے اتنے خیر خواہ بن جائیں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے خدا سے دعا کرنے لگیں وہاں اس کا لازمی فائدہ یہ ہوگا کہ پوری سوسائٹی میں مثبت نفسیات کو فروغ حاصل ہوگا، اور بلاشبہ بہتر سوسائٹی بنانے کے لیے سب سے زیادہ ضروری جو چیز مطلوب ہے وہ یہی مثبت نفسیات ہے۔

تعمیر کی طاقت

دوسری عالمی جنگ سے لے کر ۱۹۹۱ تک کا زمانہ امریکہ اور سوویت یونین کی عظمت کا زمانہ ہے۔ ان دونوں سلطنتوں کو سپر پاور کہا جانے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہی دو ملک تھے جن کے پاس سب سے زیادہ ایٹم بم تھے۔ ایٹم بموں کی ملکیت نے انھیں سپر پاور بنا دیا۔

مگر تحقیقات نے بتایا کہ ایٹم بم اپنی ساری فوجی طاقت کے باوجود قابل استعمال ہی نہیں ہیں۔ قدیم زمانہ کے ہتھیار (تلوار وغیرہ) کی تخریب کاری محدود ہوتی تھی۔ مگر ایٹم بم کی تخریب کاری لامحدود ہے۔ یہ بم اگر استعمال کیے جائیں تو ان سے عالمی تباہی پیدا ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مفتوح کے ساتھ خود فاتح بھی تباہ ہو چکا ہوگا۔ اس طرح کے مختلف حقائق نے ایٹم بم کے استعمال کو ناممکن بنا دیا۔

ایٹم بم اور دوسرے جدید ہتھیاروں کی تیاری میں امریکہ اور سوویت یونین دونوں کی اقتصادیات کو غیر معمولی نقصان پہنچا تھا۔ امریکہ کی اقتصادیات کھوکھلی ہوگئی۔ مثال کے طور پر امریکہ کے اوپر اس وقت چالیس بلین ڈالر سے زیادہ جاپان کا قرض ہے۔ سوویت یونین کی اقتصادیات مکمل طور پر تباہ ہوگئی۔ حتی کہ اس کا عظیم ایمپائر ٹوٹ کر ختم ہوگیا۔

۱۹۹۲ سے جدید تاریخ کا نیا دور شروع ہوا۔ اس نئے دور کا نتیجہ امریکی میگزین ٹائم (۱۰ فروری ۱۹۹۲) کے الفاظ میں یہ ہے کہ امریکہ میں اب عام طور پر یہ کہا جانے لگا ہے کہ سرد جنگ ختم ہوگئی اور جاپان جیت گیا۔ امریکہ کی عالمی فوجی سیادت کی معقولیت باقی نہیں رہی۔ امریکہ کو دنیا کی پیچیدہ اقتصادیات میں اب نئی جگہ تلاش کرنا ہوگا۔ امریکہ اگرچہ اب بھی بہت طاقتور اقتصادیات کا مالک ہے مگر وہ محسوس کرنے لگا ہے جیسے کہ اب وہ ایک تخفیف شدہ چیز ہے :

This is becoming a familiar line: "The cold war is over, and Japan won." Much of the rationale for America's global military role is gone, and the U.S. must now find a new place in a complex world economy ... America, still the most powerful economy, nonetheless feels itself to be somehow the diminished thing (p.9)

جنگ کے حالات میں وہ قوم دنیا کی قائد نظر آتی ہے جس کے پاس تخریب کی طاقت ہو۔ مگر امن کے حالات میں وہ قوم قیادت کرتی ہے جو دنیا کو امن کا تحفہ دے سکے۔

قیمت ضروری

ایر پورٹ پر خود کار اسکیل (ترازو) رکھا ہوا تھا۔ اس میں ایک روپیہ ڈالنے کے بعد ایک ٹکٹ نکلتا تھا جس پر آدمی کا وزن چھپا ہوا ہوتا تھا۔

ایک بچہ اسکیل کے تختہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ کا سکہ تھا۔ اس نے یہ سکہ اسکیل کے مخصوص خانہ میں ڈالا۔ اس کے بعد کھٹ کھٹ کی سی آواز ہوئی اور پھر ایک چھپا ہوا کارڈ سامنے آگیا۔ اس پر بچہ کا وزن واضح حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔

بچہ کو یہ چیز ایک کھیل سی معلوم ہوئی۔ اس نے اپنے والدین سے مزید سکے مانگے۔ وہ اس فعل کو بار بار دہراتا رہا۔ ہر بار جب وہ اپنا سکہ مشین میں ڈالتا تو چند سکنڈ کے بعد ایک خوب صورت کارڈ باہر آجاتا۔ آخر والدین کے سب سکے ختم ہو گئے۔ اب ان کے پاس روپیہ کے بجائے پچاس پیسہ کا سکہ تھا۔ بچہ نے پچاس پیسہ کا سکہ لے کر اس کو مشین میں ڈالا۔ اس کے بعد کھٹ کھٹ کی آواز تو سنائی دی مگر حسب سابق وزن کا کارڈ باہر نہیں آیا۔ مشین کی طرف سے رسپانس نہ ملنے پر بچہ رونے لگا۔

کم عمر بچہ اس واقعہ کی توجیہہ نہ کر سکا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ معاملہ رونے کا نہیں بلکہ سبق لینے کا تھا۔ مشین نے اپنی خاموش زبان میں ایک ایسا سبق دیا جو بچہ کے لیے اور اس کے سرپرستوں کے لیے عظیم اہمیت رکھتا تھا۔ یہ سبق کہ یہاں ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ اگر تم نے وہ قیمت ادا نہیں کی تو تم کو مطلوبہ چیز بھی نہیں ملے گی، حتی کہ اس وقت بھی نہیں جب کہ تم نے اصل قیمت سے کم قیمت ادا کی ہو۔

یہی قانون موجودہ دنیا کے لیے ہے اور یہی قانون آخرت کے لیے بھی۔ دونوں دنیاؤں میں آدمی کسی چیز کو اسی وقت پا سکتا ہے جب کہ وہ حسب اصول اس کی پوری قیمت ادا کرے۔ جو شخص قیمت ادا کرنے پر راضی نہ ہو، اس کو یہ امید بھی نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی مطلوبہ چیز اس کے حصہ میں آسکے گی۔

قیمت کا قانون ایک اٹل قانون ہے۔ نہ کسی کی خوش گمانیاں اس قانون کو بدل سکتیں۔ اور نہ احتجاج اور شکایت کے ذریعہ اس کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

درست حل

ٹائمس آف انڈیا (۷ جنوری ۱۹۹۲) میں مسٹر نانی اے پالکھی والا کا ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے ـــــــ ٹکراؤ سے ایکتا تک :

From confrontation to integration

اس آرٹیکل کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان کے موجودہ فرقہ وارانہ اختلافات کا حل تمام مذاہب کے اتحاد (harmony of religions) کا نظریہ ہے جو ہندو ازم کی اصل بنیاد ہے۔ اور جس کو شنکراچاریہ اور دوسرے لوگوں نے پیش کیا ہے۔

مگر صحیح بات یہ ہے کہ مذاہب کے درمیان رواداری کا نظریہ ہمارے مسئلہ کا حل ہے نہ کہ مذاہب کے درمیان اتحاد کا نظریہ۔ ایک لفظ میں، ہارمنی آف ریلیجنز نہیں بلکہ ہارمنی بٹوین کمیونیٹیز وہ چیز ہے جو ملک میں یک جہتی اور ایکتا کا ماحول پیدا کر سکتی ہے۔

مذہب کے دائرہ سے باہر آج بھی اسی اصول پر سماج کا پورا نظام قائم ہے۔ ایک گھر یا ایک کمیونٹی کے افراد دنیوی معاملات میں الگ الگ ذوق رکھتے ہیں۔ اسی طرح ملک میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ہر ایک کا سیاسی نقطۂ نظر الگ الگ ہے۔ اس کے باوجود سب مل کر رہتے ہیں۔ یہ ملاپ فرق کو مٹا کر قائم نہیں ہوا ہے بلکہ فرق کو برداشت کرنے پر قائم ہوا ہے۔

ٹھیک یہی تدبیر مذہب کے معاملہ میں بھی کار آمد ہے۔ یہاں بھی اس کی ضرورت نہیں کہ مذہبوں کے فرق کو مٹایا جائے یا یہ ثابت کیا جائے کہ ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں کوئی فرق نہیں۔ اس قسم کی غیر ضروری کوشش کے بجائے کرنے کا کام یہ ہے کہ لوگوں میں رواداری (tolerance) کا مزاج پیدا کیا جائے۔ دوسرے شعبوں میں رواداری کی بنیاد پر اتحاد قائم ہے۔ اسی تجربہ کو ہمیں مذہب کے دائرہ میں بھی اختیار کرنا ہے۔

مذاہب کی وحدت کا نظریہ نہ فطری ہے اور نہ قابل عمل۔ جب کہ اہل مذاہب کے درمیان رواداری کا نظریہ فطری بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ عقل مندی یہ ہے کہ بے فائدہ کوشش سے بچا جائے اور وہ کوشش کی جائے جس سے مطلوبہ نتیجہ نکل سکتا ہو۔

ناامیدی

ہوم افیرس کے منسٹر آف اسٹیٹ ایم ایم جیکب نے راجیہ میں بتایا کہ یکم جنوری ۱۹۸۸ سے لے کر ۳۰ جون ۱۹۹۱ تک ساڑھے تین سال میں صرف دہلی میں جن لوگوں نے خودکشی کی ان کی تعداد ۲۷۰۰ ہے۔ خودکشی کے اقدام کا بنیادی سبب انتہائی مایوسی (extreme frustration) تھا

(ہندستان ٹائمس یکم اگست ۱۹۹۱)

واقعات بتاتے ہیں کہ خودکشی کرنے والے زیادہ تر غیر معذور لوگ ہوتے ہیں۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی معذور اور لاچار آدمی اپنے آپ کو ہلاک کر کے خودکشی کرلے۔

ایک شخص نے بی اے پاس کرلیا تھا مگر ایم اے میں اس کو داخلہ نہیں ملا اس لیے اس نے خودکشی کرلی۔ ایک شخص نے اپنی ڈگری کی تعلیم مکمل کرلی مگر اس کے بعد اس کو ملازمت نہیں ملی اس لیے اس نے خودکشی کرلی۔ ایک شخص کا پروموشن دس سال تک رکا رہا اس نے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔ ایک شخص اپنی پسندیدہ عورت سے شادی نہ کرسکا اس لیے اس نے زہر کھا کر اپنا خاتمہ کرلیا۔ وغیرہ۔

خودکشی کرنے والے افراد کا معاملہ زیادہ تر یہ تھا کہ وہ تندرست تھے۔ ان کو کھانا کپڑا بھی مل رہا تھا۔ بقدر ضرورت اسباب حیات انھیں حاصل تھے۔ مگر وہ اپنی ایک مطلوب چیز کو پانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ اس بنا پر وہ شدید محرومی کا شکار ہوگئے اور خودکشی کا اقدام کر بیٹھے۔

اس دنیا میں سب سے بڑی چیز امید ہے۔ امید پر آدمی جیتا ہے اور اگر امید باقی نہ رہے تو اس کو اپنی زندگی اتنی زیادہ بے معنی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاک کرلیتا ہے۔

مگر ان تمام لوگوں کی مشترک غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے حال کو دیکھا، مگر وہ اپنے مستقبل کو نہ دیکھ سکے۔ کوئی آدمی حال میں اگر کم پائے ہوئے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مستقبل میں بھی کم ہی پر باقی رہے گا، اگر وہ اپنے وجود کو اور اپنے ملے ہوئے مواقع کو استعمال کرے تو عین ممکن ہے کہ آئندہ وہ ان تمام چیزوں کو پالے جن کو وہ اپنے آج کے حالات میں نہ پاسکا۔

حال پر نظر آدمی کو مایوس کرتی ہے۔ لیکن مستقبل پر نظر اس کو حوصلہ مند انسان بنا دیتی ہے۔

ایک واقعہ دو انجام

جمیل اختر خاں صاحب سعودی عرب کے ایک شہر میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۹۲ میں خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہوا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ ان کے اپنے الفاظ میں حسب ذیل ہے :

"جولائی ۱۹۹۱ کی ایک شام ہے۔ مغرب کی اذان ہو چکی ہے۔ میں کمرہ سے نکل رہا ہوں۔ گیٹ کے باہر چند لڑکے راہ گیروں سے چھیڑ خانی کرتے نظر آرہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ لڑکے لپکے۔ ان کے ہاتھ میں خرگوش کے قسم کا کوئی جنگلی جانور ہے۔ مجھے ڈراتے رہے۔ ایک نے چاہا سر یا کندھے پر پھینک دیں اور پھر تماشہ دیکھیں۔ میں بھانپ گیا کہ اگر ان سے الجھا تو خیر نہیں۔ دل ہی دل میں سوچ لیا کہ یہ جو بھی بے ہودہ حرکت کریں ردعمل کا اظہار نہیں کروں گا۔ میں تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف چلتا رہا۔ میری بے توجہی پر ان لڑکوں نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا یہاں تک کہ میں بے ضرر مسجد پہنچ گیا۔

نماز سے فراغت کے بعد جب کمرہ میں واپس آرہا ہوں تو ایک اور منظر سامنے ہے۔ دیکھا وہی لڑکے ایک پاکستانی مسلمان سے الجھے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے اس جانور کو اس کے بدن پر پھینک دیا۔ اس پر وہ غصہ ہو گیا۔ ایک لڑکے کو مار بیٹھا۔ بس یہیں سے کھیل شروع ہو گیا۔ نتیجۃً درجن بھر لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی سر کی مالش کر رہا ہے، کوئی پیٹھ کو تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے۔ ایک نے پیچھے سے دونوں بانہہ پکڑ لیا۔ دوسرے نے سینہ پر گھما گھمی شروع کر دی۔ کسی طرح ایک سے جان چھڑاتا تو دوسرا لپٹ جاتا۔ مار مار کر اس کا برا حال کر دیا۔ کون تھا جو اسے چھڑانے جاتا اور اپنی شامت مول لیتا۔ یہاں تک کہ ایک سعودی جو اس راہ سے گزر رہا تھا، رحم آیا۔ گاڑی روکی۔ دخل اندازی کر کے معاملہ رفع دفع کیا۔ ان صاحب کو معلوم نہیں کتنے دنوں تک چوٹ اور غم کے ساتھ بستر پکڑے رہنا پڑا ہوگا۔

ایک ہی معاملہ میں ایک کی "نظر انداز کی پالیسی" نے بے ضرر چھوڑ دیا دوسرے کو بے صبری کا بروقت تحفہ مل گیا۔ حالانکہ وہ صاحب اگر صرف اتنا کرتے کہ چند قدم لپکتے ہوئے چلتے تو کمرہ میں پہنچ جاتے۔ بعد میں کمرہ میں پہنچے مگر اس حال میں کہ چوٹ سے نڈھال تھے۔ میں نے سوچا انفرادی معاملہ میں بے صبری یہ رنگ لا سکتی ہے تو اجتماعی معاملہ میں وہ کتنا زیادہ سنگین ہو جائے گی۔"

نکتہ آفرینی

ایک صاحب نے کالج کے یونین ہال میں تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی زبان عربی سے ماخوذ ہے۔ انگریزی کے تمام الفاظ عربی زبان سے سرقہ کر کے حاصل کیے گئے ہیں۔ ایک طالب علم کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ آپ تو بڑی عجیب بات کہہ رہے ہیں۔

مقرر نے کہا کہ آپ کو تعجب کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ تجربہ کر لیجئے۔ آپ کوئی بھی انگریزی کا لفظ بولئے۔ میں بتا دوں گا کہ وہ عربی کے کس لفظ کو لے کر بنایا گیا ہے۔ طالب علم نے کچھ دیر تک سوچا۔ پھر بولا کہ اچھا بتائیے، بلائنڈ (blind) کا لفظ کس عربی لفظ سے بنا ہے۔ مقرر نے فوراً کہا : بلاعین۔

اس کے بعد ایک اور مقرر کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ انگریزی کے تمام لفظ اردو سے لیے گئے ہیں۔ انگریزی زبان پوری کی پوری اردو زبان پر مبنی ہے۔ دوبارہ ایک شخص کھڑا ہوا۔ اس نے کہا کہ آپ کا یہ دعویٰ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ مقرر نے کہا کہ آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ آپ انگریزی کا کوئی لفظ بولیں۔ میں فوراً بتا دوں گا کہ وہ کس اردو لفظ سے ماخوذ ہے۔ آدمی نے سوچ کر کہا کہ ڈیکوریشن (decoration) کس اردو لفظ سے بنا ہے۔ مقرر نے فوراً جواب دیا : دیکھو رے شان۔

پھر تیسرے صاحب اٹھے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی زبان ساری کی ساری ہندی زبان کے الفاظ لے کر بنائی گئی ہے۔ دوبارہ حاضرین میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ مقرر نے کہا کہ آپ انگریزی کا کوئی لفظ بولئے۔ پھر میں بتاؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ لو (love) کس ہندی لفظ سے بنا ہے۔ مقرر نے فوراً کہا "لوبھ"

اس قسم کی باتیں استدلال نہیں، وہ نکتہ آفرینی ہیں۔ اس طرح کے نکتوں سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ ثبوت کا تعلق حقائق واقعی سے ہے نہ کہ نکتوں اور لطیفوں سے۔

دانش مند وہ ہے جو دلیل اور لطیفہ کے فرق کو سمجھے۔ وہ دلیل والی بات کو اپنائے اور جو بات محض لطیفہ ہو اس سے اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔

داعیانہ صبر

قرآن میں انذار وتبشیر اور دعوت الی اللہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اور اللہ کے لیے صبر کرو (ولربك فاصبر) المدثر ۔ ۷

اس آیت میں جس صبر کا ذکر ہے اس سے مراد داعیانہ صبر ہے۔ یعنی دعوت کی راہ میں مدعو کی طرف سے جو زیادتی یا اشتعال انگیزی کی جائے اس پر بے صبر نہ ہو جاؤ، بلکہ مدعو کی روش سے قطع نظر کرتے ہوئے یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو صبر و اعراض کے رویہ پر قائم رکھو۔

اس صبر کو اللہ کے لیے کیا جانے والا صبر اس لیے فرمایا کہ وہ تمام تر اللہ کے منصوبہ کی تکمیل کے لیے ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ داعی کے غیر صابرانہ جواب سے مدعو بدک نہ جائے اور داعی کی بات پر دھیان دینے کے لیے تیار نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو موجودہ دنیا میں آزمائش کے لیے رکھا ہے۔ یہاں کی محدود مدت میں انسان جیسا عمل کرے گا اسی کے مطابق اگلی لامحدود زندگی میں اس کے ساتھ انعام یا سزا کا معاملہ کیا جائے گا۔ یہ ایک بے حد نازک صورت حال ہے، کیونکہ انسان کو اگر زندگی کی اس امتحانی نوعیت سے پوری طرح باخبر نہ کیا جائے تو وہ قیامت کے دن کہہ سکتا ہے کہ ہمیں تو اس کی خبر ہی نہ تھی، ایسی حالت میں کیوں ہم کو پکڑا جاتا ہے اور ہمارا حساب لیا جاتا ہے۔

یہ ایک بے حد نازک معاملہ ہے۔ اگر لوگوں کو پوری طرح باخبر کر دیا جائے تو حجت لوگوں کے اوپر چلی جاتی ہے۔ اور اگر لوگوں کو خبردار نہ کیا جائے تو حجت اللہ کی طرف لوٹ جاتی ہے (نساء ۱۶۵) چونکہ دعوت الی اللہ کا عمل اس حجت کو اللہ سے ہٹاتا ہے اس لیے اللہ نے اس کو اپنا کام فرمایا ہے اور اس کے لیے صبر کرنے کو اللہ کے لیے صبر کرنا قرار دیا ہے۔

داعی گروہ اگر مدعو کی زیادتیوں پر صبر کر کے اپنا دعوتی عمل جاری رکھے۔ تو اس کا یہ صبر اللہ کے لیے کیا جانے والا صبر ہوگا۔ اس کا اللہ کے یہاں بہت بڑا اجر ہے۔ اس کے برعکس اگر داعی مدعو کی زیادتیوں پر مشتعل ہو جائے تو اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کو اللہ کے لیے صبر کرنے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ اللہ کے لیے صبر کرنے پر راضی نہ ہوا۔

قرآنی طریقہ

موجودہ دنیا میں آدمی امتحان کی حالت میں ہے۔ اور جب وہ امتحان کی حالت میں ہے تو اس کو آزادی بھی دی گئی ہے۔ اب کچھ لوگ آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ آزادی کے غلط استعمال ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں فساد ہوتا ہے۔ باہمی مقابلے پیش آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف عداوتیں جاگتی ہیں۔ اجتماعی زندگی میں تلخی اور شکایت کے لمحات پیش آتے ہیں۔ یہ سب عین قانون قدرت کے تحت ہوتا ہے۔ اور جو چیز خود قدرت کے منصوبہ کے تحت پیش آئے اس کو ختم کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اب اس کا حل کیا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر اس کا حل بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگ ردعمل کا طریقہ نہ اختیار کریں بلکہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے حکمت اور تدبیر کے ساتھ معاملہ کریں :

جہالت کے مقابلہ میں اعراض	الاعراف	۱۹۹
عمل سوء کے مقابلہ میں عمل حسن	حم السجدہ	۳۴
ایذا رسانی کے مقابلہ میں صبر	ابراہیم	۱۲
حمیت جاہلیہ کے مقابلہ میں سکینہ	الفتح	۲۶

قرآن کی ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرکے دوسرے شخص کو اذیت پہنچائے تو دوسرے شخص کو جوابی طریقہ نہیں اختیار کرنا ہے بلکہ برداشت کا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ اس کو اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہونا ہے۔ اس کو نفرت کے جواب میں محبت کا تحفہ پیش کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے تو قدرت کا قانون حرکت میں آئے گا اور وہ زیادہ بہتر طور پر اس کے مسئلہ کو حل کر دے گا۔

صبر و اعراض انسان کا معاملہ نہیں، وہ حقیقۃً خدا کا معاملہ ہے۔ یہ خود خدا کی مرضی ہے کہ لوگ صبر کریں۔ کیونکہ اس کے بغیر خدا کا منصوبۂ امتحان مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ثواب بہت ہے۔ بلکہ اس کا ثواب تمام دوسرے اعمال سے زیادہ ہے۔ قرآن میں خصوصی طور پر وعدہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے لیے صبر کریں ان کو ان کا اجر بے حساب مقدار میں دیا جائے گا۔

جنگ، امن

الرسالہ کا شمارہ مئی ۱۹۹۱ "خلیج ڈائری" کے طور پر شائع ہوا تھا۔ ۲ فروری ۱۹۹۱ کو میں نے اپنی ڈائری میں جو صفحہ لکھا تھا، اس میں یہ الفاظ تحریر کیے تھے : اس جنگ میں فتح کا تمغہ خواہ جس فریق کو ملے، عام انسان کی مصیبتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ اور یہ مصیبتیں عالمی ہوں گی، حتی کہ ان مصیبتوں کا برا اثر اس ملک تک بھی پہنچ جائے گا جس نے جنگ کے بعد فتح کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

اس تحریر کے ایک ماہ بعد جنگ بندی ہوئی تو واقعۃً ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ جنگ ختم ہو گئی مگر مسائل ختم نہیں ہوئے۔ ٹائم میگزین (۱۵ اپریل ۱۹۹۱) نے اس کے بارہ میں تفصیلی رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا ہے کہ خلیج میں فتح کے باوجود کس طرح نئے مسائل کا سامنا درپیش ہے۔ ٹائم نے لکھا ہے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی اب ایک نئی مشکل سے دوچار ہو رہے ہیں :

America and its allies confront a new dilemma. (p.18)

ٹائم کے مذکورہ شمارہ کو پڑھنے کے بعد ٹائم کے کچھ قارئین نے اس کو خطوط لکھے ہیں۔ یہ خطوط میگزین کے شمارہ ۶ مئی ۱۹۹۱ میں چھپے ہیں۔ ایک امریکی مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر بش نے خلیج میں لڑائی جیت لی مگر وہ جنگ کو ہار گئے :

It looks like Bush has won the battle. . .
and lost the war in the Gulf.
(Lloyd Ringuist, Marshfield, Wisconsin)

لڑائی صرف تخریب برپا کرتی ہے، وہ تعمیر کا واقعہ ظہور میں نہیں لا سکتی۔ لڑائی میدانِ جنگ میں جیتی جا سکتی ہے، مگر میدانِ جنگ کے باہر حقیقی زندگی میں وہ فتح کی خوشی نہیں دیتی۔ اس کے باوجود کیوں لوگ لڑائی کی طرف دوڑتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑائی لوگوں کو بڑی چیز معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ باعتبار حقیقت امن بڑی چیز ہے اور جنگ چھوٹی چیز۔ اگر لوگ اس حقیقت کو جان لیں تو ہر آدمی پُرامن تعمیر کی طرف دوڑے، اور جنگ کا میدان ہمیشہ کے لیے انسانوں سے خالی ہو جائے۔

جنگ ہیرو ازم ہے، مگر جنگ کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں۔ امن بظاہر زیرو ازم ہے، مگر تمام بہترین کامیابیاں ہمیشہ امن ہی کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہیں۔

جڑ کی بات

۱۸ اپریل ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ میری ملاقات ڈاکٹر عبد السلام صاحب سے ہوئی۔ وہ پچھلے ۲۵ سال سے امریکہ (Tel. 312-267-4740) میں رہتے ہیں۔ وہاں وہ شکاگو کی نارتھ ایسٹرن یونی ورسٹی میں میتھیمیٹکس کے پروفیسر ہیں۔

سلمان رشدی کے مسئلہ پر گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ مارچ ۱۹۸۹ میں ان کی یونیورسٹی میں "رشدی افیئر" پر ایک سمینار کیا گیا۔ یونی ورسٹی کے مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن نے اس سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا، اس کا ایک جزء ان کے الفاظ میں یہ تھا :

A student in the meeting exclaimed that Rushdie should be killed for his crime. I reminded him that everybody should be serious when speaking. If he really believed that it is his duty to kill Rushdie, by now he would have been in London, and not here talking about it.

ایک مسلمان طالب علم نے اس میٹنگ میں پُرجوش طور پر کہا کہ رشدی کو شتم رسول کے جرم میں قتل کرنا ضروری ہے۔ میں نے طالب علم کو یاد دلایا کہ ہر آدمی کو اپنے قول میں سنجیدہ ہونا چاہیے۔ اگر واقعۃً وہ یقین رکھتا ہے کہ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ رشدی کو قتل کر دے تو اس وقت اُس کو لندن میں ہونا چاہیے نہ کہ وہ یہاں رہ کر صرف قتل کی باتیں کر رہا ہو۔

یہ واقعہ علامتی طور پر ایک بہت بڑی خرابی کو بتاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی وہ کون سی کمزوری ہے جس نے ان کا یہ حال کر رکھا ہے کہ ان کے یہاں قول کے ہنگامے تو احتساب عالم کی سطح پر جاری ہیں۔ مگر عمل کی سطح پر ابھی تک احیار ملت کی ابتدائی بنیاد بھی قائم نہ کی جا سکی۔

یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر اسی کمزوری میں مبتلا ہے۔ وہ کہتا ہے مگر وہ کرتا نہیں۔ وہ قوال ہے مگر وہ فعال نہیں۔ مگر جس قول کے ساتھ عمل شامل نہ ہو وہ گناہ ہے نہ کہ کوئی مطلوب عمل۔

عقل والے لوگ

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا الی اللہ لھم البشریٰ، فبشر عباد۔ الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھداھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب

(الزمر ۱۷-۱۸)

اور جو لوگ شیطان سے بچے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے ان کے لیے خوش خبری ہے۔ تو تم میرے بندوں کو خوش خبری دے دو، جو بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اس کے بہتر پہلو کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں۔

اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ احسن القول کو لو اور اسو والقول کو چھوڑ دو۔ کسی قول کا احسن اور اسو (اچھا اور برا پہلو) اس کے مفہوم میں نہیں ہوتا بلکہ اس کے الفاظ میں ہوتا ہے۔ کوئی کلام، خواہ وہ کوئی مقدس کلام کیوں نہ ہو، وہ بہر حال انسانی زبان میں ہوتا ہے۔ انسانی زبان کی محدودیت کی بنا پر اس کے ظاہر الفاظ میں اچھا اور برا، دونوں پہلو نکالنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر اللہ کا ڈر آدمی کو سنجیدہ اور محتاط بنا دیتا ہے۔ اس لیے اللہ سے ڈرنے والے آدمی کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کلام کو نہایت غور کے ساتھ سنتا ہے۔ اس کے بعد وہ کلام کو اس مفہوم میں لیتا ہے جو اس کا اچھا مفہوم ہے۔ وہ کلام کو اس کے برے مفہوم میں نہیں لیتا۔

جو لوگ کسی کلام کو بے پروائی کے ساتھ سنیں اور اس کے بعد اس کا ایک برا مفہوم نکال کر اس کو ادھر اُدھر بیان کرنے لگیں وہ شیطان کی پیروی کرنے والے ہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بری خبر ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ کلام کو پورے دھیان کے ساتھ سنیں اور پھر اس کا اچھا مفہوم نکال کر اس کو لوگوں کے سامنے پیش کریں، وہ حق کی پیروی کرنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے یہاں اچھی خبر ہے اور ان کے لیے بڑا انعام ہے۔

کلام کو برے مفہوم میں لینے والا آدمی بے عقل آدمی ہے۔ اور جو آدمی کلام کو اچھے مفہوم میں لے وہی عقل والا ہے۔ آخرت میں اس کو جنت کے باغوں میں بسایا جائے گا۔

اِس کا سبب

قدیم زمانہ میں جن لوگوں نے پیغمبروں کی مخالفت کی، انھوں نے لوگوں کو دو قسموں میں بانٹ رکھا تھا۔ اراذل (ہود ۲۷) اور اعاظم (الزخرف ۳۱)۔ ان کی تقسیم میں جو لوگ اراذل تھے انھیں میں سے کچھ افراد نے پیغمبروں کا ساتھ دیا۔ اور جن لوگوں کو قوم نے اعاظم کا درجہ دے رکھا تھا، وہ پیغمبروں کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہ تھی۔ مزید ان کا حال یہ تھا کہ اعاظم کی صف کا کوئی آدمی اگر پیغمبروں کو مان کر اس کا ساتھی بن جاتا تو فوراً ہی وہ قوم کی نظروں سے گر جاتا، وہ اپنی عظیم ہونے کی حیثیت کو کھو دیتا تھا۔ مثال کے طور پر ابوبکر بن ابی قحافہ مکہ کے گروہ اعاظم سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر جب وہ پیغمبر کے ساتھی بن گئے تو مخالفین نے ان کو مجنون بن ابی قحافہ کہنا شروع کر دیا۔ اسی طرح عبداللہ بن سلام یہودیوں کے بڑے عالم تھے، مگر جب انھوں نے آپ کا ساتھ دیا تو یہودیوں نے کہا کہ وہ جاہل بن سلام ہیں۔ وغیرہ

قدیم مکہ کے لوگ مکہ کے ولید بن مغیرہ اور طائف کے ابومسعود کو نعوذ باللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں عظیم سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ کو اگر اپنی کتاب اتارنا تھا تو ان اعاظم کے اوپر اس کو کیوں نہیں اتارا (الزخرف ۳۱)

ان کی اس سوچ کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غیر رواجی مذہب لے کر اٹھے تھے۔ اور ان کے اپنے سرداروں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ وقت کے مروجہ مذہب کے نمائندہ بنے ہوئے تھے۔ رسول اللہ کا مذہب اس وقت ایک نیا مذہب تھا اور اہل مکہ کا مذہب قدیم مذہب۔ رسول اللہ کے مذہب کی پشت پر ابھی صرف دلیل کی طاقت تھی، جب کہ اہل مکہ کے مذہب کی پشت پر سیکڑوں سال کی روایات کا وزن شامل تھا۔ چنانچہ ایک فریق انھیں مذہب اکابر پر دکھائی دیتا تھا اور دوسرا فریق مذہب اصاغر پر۔

انسان کا یہ مزاج ہے کہ قدیم اس کی نظر میں عظیم بن جاتا ہے۔ یہی انسانی مزاج تھا جس نے مذکورہ بالا مسئلہ پیدا کیا۔

خدائی منصوبہ کے خلاف

زندگی کیا ہے اور انسان کی کامیابی کس چیز میں ہے، ان سوالات کو ایک لفظ میں "نوعیت حیات" کہا جا سکتا ہے۔ اسلام اسی نوعیت حیات کا خدائی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی منشا ہے کہ نوعیت حیات کا یہ علم ہمیشہ تمام انسانوں تک پہنچتا رہے۔

اس تبلیغی عمل کو مستحکم اور یقینی بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں ایسے انقلابات برپا کیے جس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تاریخی طور پر ایک مسلّم نبوت بن گئی۔ قرآن ایک ایسی محفوظ کتاب بن گیا جس میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کی جا سکے۔ اسلام کی بنیاد پر ایک مکمل تاریخ ظہور میں لائی گئی۔ ساری دنیا میں مسلمان اتنی بڑی تعداد میں پھیلا دیے گئے کہ آج دنیا کی آبادی میں ہر پانچ آدمی میں سے ایک آدمی مسلمان ہے۔ وغیرہ

اس قسم کے وسیع انتظامات اس بات کی یقینی ضمانت تھے کہ اسلام کا پیغام مسلسل تمام اہل عالم تک پہنچتا رہے۔ اور ماضی میں بلاشبہہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، ان کی ایک غلطی نے سارے دعوتی انتظامات کو عملاً معطل کر دیا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ ان رہنماؤں نے اپنی خود ساختہ تحریکوں کے ذریعہ اسلام کو جنگ جو مذہب کا روپ دے دیا۔

کہیں سیاسی آزادی حاصل کرنے کے نام پر، کہیں اسلامی حکومت قائم کرنے کے نام پر، کہیں سرخ یا سفید سامراج کے ظلم کو مٹانے کے نام پر، کہیں صلیبی اور صہیونی تدخل کو ختم کرنے کے نام پر، کہیں ملکی حقوق اور ملی تحفظ حاصل کرنے کے نام پر، غرض کسی نہ کسی نام پر ساری دنیا کے مسلمان ٹکراؤ میں اور لڑائی میں مصروف کر دیے گئے۔ اور کہا گیا کہ یہ اسلامی جہاد ہے۔

ان بے معنی لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان معتدل تعلقات باقی نہ رہے۔ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان معتدل تعلقات ہوں تو اسلام کا تعارف اپنے آپ ہوتا رہتا ہے۔ مگر جب دونوں میں معتدل تعلقات باقی نہ رہیں تو مسلمان اور ان کا دین دونوں ہی نفرت کا موضوع بن جاتے ہیں، اور نفرت اور تناؤ کی فضا میں اسلام کا دعوتی عمل جاری رہنا ممکن نہیں۔ یہ صورت حال خدا کے منصوبہ میں مداخلت کے ہم معنی ہے۔

معرفتِ حق

موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان ہیں جن کا حال یہ ہے کہ وہ انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ حج کے لیے جائیں گے اور واپس آکر نہایت والہانہ اور عاشقانہ انداز میں حج کا سفرنامہ لکھ کر شائع کریں گے۔ دوسری طرف انھیں لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ حقارت کا معاملہ کر رہے ہیں۔ وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کے خلاف بے بنیاد الزام گھڑ کر اس کو زبان وقلم کے ذریعہ پھیلا رہے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو بندۂ مومن کی تحقیر کرتے ہیں۔ اور جب حرم مکی اور حرم مدنی کا ذکر ہو تو وہ غایت درجہ تکریم کے الفاظ بولتے ہیں۔ حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ مومن کا عزت واحترام کعبہ کے عزت واحترام سے بھی زیادہ ہے (المؤمن اکرم حرمۃ من الکعبۃ)

اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب ان عاشقین مدینہ کی بے بصیرتی ہے۔ وہ حقائق ظاہری کو تو خوب دیکھتے ہیں مگر حقائق معنوی ان کو دکھائی نہیں دیتے۔ ان کو وہ اسلام نظر آتا ہے جو تاریخی عظمت، مادی شوکت اور انسانوں کی بھیڑ کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہو۔ اور جو اسلام ظواہر سے خالی ہو۔ جس کو جاننے کے لیے جوہر شناسی اور معرفتِ باطنی کی صلاحیت درکار ہو۔ اس کے ادراک سے وہ بے بہرہ رہتے ہیں۔

قدیم عرب کے جن لوگوں کو قرآن میں اندھا اور بہرہ بتایا گیا ان کا معاملہ یہی تھا۔ وہ "حرم مکی" کا تو خوب احترام کرتے تھے مگر انھوں نے رسولؐ اور اصحاب رسول کی بے حرمتی کی۔ کیوں کہ "حرم" کی سطح پر جو دین تھا اس میں ان کو تاریخی عظمتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے برعکس رسول اور اصحاب رسول کا دین ابھی تاریخی عظمتوں اور مادی شوکتوں سے خالی تھا۔ اس وقت رسول والے دین کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے جوہر شناسی کی صلاحیت درکار تھی جس سے وہ محروم تھے۔ چنانچہ انھیں اندھا اور بہرا قرار دے دیا گیا۔

ایمان معرفت حق کا نام ہے۔ مومن وہ جوہر شناس انسان ہے جو سچائی کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھے، جو ظواہر سے بلند ہو کر حقائق کو دریافت کر لے۔

دو لفظ

اگر موت کا فرشتہ آئے اور کہے کہ ہم تمہاری روح قبض کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اب تم کو صرف دو لفظ بولنے کا مزید موقع ہے۔ جو بھی دو لفظ تم کو کہنا ہے، کہہ دو، اس کے بعد تم کو اس دنیا سے اٹھا لیا جائے گا۔ اگر ایسا ہو تو میں فوراً کہوں گا ——— خود احتسابی۔

خود احتسابی (self-criticism) میرے علم اور تجربہ کے مطابق، دانائی کا سب سے بڑا کلمہ ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ مادہ ہو کہ وہ اپنے اوپر تنقید کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس نظر سے دیکھے جس نظر سے اس کا خارجی محتسب اس کو دیکھتا ہے، وہ یقینی طور پر عارف بن جائے گا۔ وہ چیزوں کو ویسا کا ویسا (as it is) دیکھنے لگے گا۔ اور جو شخص اپنے اندر یہ صفت پیدا کر لے، اس نے دنیا میں بھی کامیابی کا راز پا لیا اور آخرت میں بھی کامیابی کا راز اس کو مل گیا۔

جو شخص اپنا احتساب کرے، دوسرا آدمی اس پر تنقید کرے تو وہ اس پر مشتعل نہ ہو بلکہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے، وہ بلاشبہ ایک عظیم انسان ہے۔ ایسا آدمی اس سے بچ جائے گا کہ وہ جھوٹے بھرم میں مبتلا ہو۔ وہ غیر حقیقی چیزوں کو حقیقی چیز سمجھ لے۔ وہ اپنی غلطیوں کو دہرانے سے محفوظ رہے گا۔ وہ فریب نفس کی بیماری میں مبتلا نہ ہوگا۔

خود احتسابی اس بات کا اعتراف ہے کہ میں انسان ہوں، میں خدا نہیں ہوں۔ وہ اس بات کا اعتراف ہے کہ حقیقت وہ ہے جو کہ ہے، نہ کہ وہ جس کو میں بطور خود حقیقت فرض کر لوں۔ خود احتسابی کی صفت آدمی کو انسانِ اصلی (man cut to size) بناتی ہے۔ وہ آدمی کو سچی معرفت تک پہنچانے والی ہے۔

جس آدمی کے اندر خود احتسابی کا مادہ نہ ہو، وہ لازمی طور پر جمود اور ٹھہراؤ میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کے برعکس خود احتسابی کا مادہ اس بات کا ضامن کہ آدمی مسلسل آگے بڑھتا رہے، اس کی ذہنی ترقی کا سفر کبھی ختم نہ ہو۔

خود احتسابی آدمی کو کامل انسان بناتی ہے۔ اور جس آدمی کے اندر خود احتسابی نہ ہو وہ ناقص انسان ہو کر رہ جائے گا۔

یہ انسان

راج تھاپر ایک ہندستانی خاتون ہیں۔ وہ سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے اندرونی حلقہ (inner circle) سے تعلق رکھتی تھیں۔ انھوں نے اپنی ایک یادداشت شائع کی ہے۔ اس کا نام یہ تمام سال (All These Years) ہے اور وہ ۴۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

راج تھاپر نے لکھا ہے کہ اندرا گاندھی کی حیثیت ابتداءً عام شہری (ordinary citizen) کی تھی۔ اس کے بعد وہ ملک کی ایک ملکہ (express) بن گئیں۔ پندرہ سال تک انھیں اقتدار حاصل رہا۔ حالت اقتدار ہی میں خود ان کے ایک باڈی گارڈ نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

راج تھاپر نے اندرا گاندھی کا واقعہ لکھا ہے۔ ایک بار اندرا گاندھی کھانے کی میز پر تھیں۔ دوسرے کئی لوگ بھی موجود تھے۔ اندرا گاندھی نے ایک ملازم کو سختی کے ساتھ اس بات پر ڈانٹا کہ اس نے پارٹی میں سب سے پہلے اندرا کے سامنے کھانا پیش نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں ان کو سبق سکھاؤں گی۔ آپ کو معلوم ہے، سربراہ سلطنت کو سب سے پہلے کھانا پیش کیا جاتا ہے :

Once she fiercely berated a servant for not serving her first at a party. Said she: "I have to teach them, you know. All heads of state are served first."

اندرا گاندھی کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ کسی مجلس میں ان کو نمبر ۲ کی حیثیت دی جائے۔ مگر ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ جلد ہی ان کا یہ بھرم ٹوٹ جانے والا ہے۔ خود ان کے باڈی گارڈ کی گولی انھیں ان کے اعلیٰ مقام سے اتار کر آخری نچلے مقام پر پہنچا دے گی۔

یہی آج ہر انسان کا حال ہے۔ جس آدمی کو جو مقام مل گیا ہے، اس میں وہ معمولی نقص بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ آخر کار وہ بالکل بے مقام ہو جانے والا ہے۔ آدمی جزئی کمی کو برداشت نہیں کرتا، حالانکہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جبکہ قدرت کا قانون اس کی مکمل نفی کر دے۔

لوگ صرف اپنے حال کو جانتے ہیں، اپنے مستقبل کی کسی کو خبر نہیں۔

تشکیل حیات

ایک مبصر نے جدید سائنسی تہذیب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے اندر فکری استحکام نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بطلیموس کی جگہ کوپرنیکس ظاہر ہوا۔ پھر کوپرنیکس کی جگہ نیوٹن نے لے لی۔ اس کے بعد نیوٹن کی جگہ آئن اسٹائن آگیا :

Copernicus replaced Ptolemy, Newton replaced Copernicus, and Einstein replaced Newton.

موجودہ دور کے کلچر کو "کلچر آف ٹکنالوجی" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک متضاد ترکیب ہے۔ کلچر اپنی ذات میں دوامیت چاہتا ہے۔ مگر سائنس یا ٹکنالوجی دوامی صفت سے خالی ہیں۔ ایسی حالت میں ٹکنالوجی کی بنیاد پر بننے والا کلچر ہمیشہ غیر مستحکم رہے گا۔ وہ انسانی فطرت کے ابدی تقاضے کو پورا نہیں کر سکتا۔

ٹکنالوجی انسان کی خادم ہے، وہ انسانی کلچر کی بنیاد نہیں۔ ٹکنالوجی صرف یہ کر سکتی ہے کہ وہ زراعت کو ہل کے دور سے نکال کر ٹریکٹر کے دور میں پہنچا دے، یا سفر کو بیل گاڑی کے دور سے آگے بڑھا کر ہوائی جہاز کے دور میں داخل کر دے۔ لیکن ٹکنالوجی حقیقی معنوں میں انسان کو کلچر یا تہذیب نہیں دے سکتی۔ ٹکنالوجی انسان کی خادم بن سکتی ہے، مگر اس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ انسان کو مذہب حیات فراہم کرنے کا کام انجام دے گی۔

ٹکنالوجی، ایک لفظ میں، خادم حیات ہے اور کلچر مذہب حیات۔ ٹکنالوجی اگر زندگی کی سواری ہے تو کلچر انسان کی منزل متعین کرنے والا ہے۔ سواری جیسی چیزوں کے معاملہ میں تبدیلی سے کوئی حقیقی نقصان نہیں۔ لیکن اگر کلچر کی بنیادوں میں تبدیلی کی جانے لگے تو پوری انسانی زندگی اپنی معنویت کھو دے گی۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ ٹکنالوجی کو زندگی کا خدمت گزار بنایا جائے۔ اور مذہب کو کلچر کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا جائے۔ پھر جب یہ دیکھا جائے کہ تمام مذاہب میں محفوظ اور ثابت شدہ مذہب صرف اسلام ہے تو یہ بات بھی طے ہو جاتی ہے کہ کلچر کے اعتبار سے زندگی کی تشکیل کے لیے واحد بنیاد صرف اسلام ہے۔ اسلام انسانی زندگی کی تشکیل کے لیے ایسی مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے جس میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں۔

اقدام، نتیجہ

ٹائم میگزین (۲۳ دسمبر ۱۹۹۱) کی کور اسٹوری سوویت یونین کے خاتمہ کے بارہ میں تھی۔ اس میں سابق سوویت یونین کے سابق صدر گورباچیف کا ایک انٹرویو (exclusive interview) شامل تھا جس کا عنوان ایک آدمی بغیر ملک (A man without a country) تھا۔

ٹائم کے شمارہ ۱۳ جنوری ۱۹۹۲ میں اس کے بارہ میں قارئین کے تاثرات چھپے ہیں۔ ٹائم کے ایک قاری نے لکھا ہے کہ گورباچیف کی قبر پر تاریخ جو کتبہ لگائے گی اس کے الفاظ کچھ اس قسم کے ہوں گے ——— یہاں ایک عمدہ آدمی اور ایک آئیڈیلسٹ آرام کر رہا ہے جس نے سوویت یونین میں جبر اور تشدد کو ختم کیا، اس حقیقت کو نہ جانتے ہوئے کہ جبر اور تشدد ہی وہ سریش تھا جو اس ایمپائر کے مختلف حصوں کو باہم جوڑے ہوئے تھا :

The epitaph of history of Mikhail Gorbachev may someday read: Here lies a good man and an idealist who abolished repression and tyranny in the Soviet Union, not comprehending that they were the glue holding that empire together. (George Podzamsky, Berwyn, Illinois)

ٹائم کے قاری کا یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ اس میں نصیحت کا پہلو یہ ہے کہ کسی اقدام کا نتیجہ آدمی کی خواہش کی بنیاد پر نہیں نکلتا بلکہ خارجی حقائق کی بنیاد پر نکلتا ہے۔

گورباچیف کا اقدام فی الاصل کیا تھا، اس سے قطع نظر، اس کی یہ نصیحت بے حد اہم ہے۔ کوئی فرد ہو یا کوئی قوم، اگر وہ کوئی عملی اقدام کرے تو اس کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ جس طرح اقدام کرنا اس کے اپنے بس میں ہے اسی طرح نتیجہ اس کے اپنے بس میں نہیں۔ نتیجہ کا معاملہ دوسرے بہت سے خارجی اسباب سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر یہ خارجی اسباب موافقت کریں تو نتیجہ موافق نکلے گا اور اگر یہ اسباب موافقت نہ کریں تو اس کے بعد موافق نتیجہ بھی نکلنے والا نہیں۔

کسی اقدام کا نتیجہ اپنی خواہش کے مطابق نہ نکلنا بلکہ حقائقِ تاریخی کے مطابق نکلنا، یہ اتنا اہم قانون ہے کہ کوئی سپر پاور بھی اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ حقائقِ خارجی ہمیشہ فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں، خواہ ہم اس کو پسند کریں یا ناپسند

تحریک کی مخالفت

مُردہ سانپ کہیں پڑا ہوا ہو تو کوئی اس کو مارنے کی ضرورت نہیں سمجھے گا۔ لیکن اگر کہیں زندہ سانپ نکل آئے تو تمام لوگ اس کو مارنے کے لیے حرکت میں آجاتے ہیں۔ یہی بلا تشبیہ تحریکوں کا معاملہ ہے۔ تحریک کی مخالفت تحریک کی زندگی کا ثبوت ہے۔ بے جان تحریک کی مخالفت کے لیے کوئی کھڑا نہیں ہوتا۔ مگر کوئی جاندار تحریک برپا ہو تو ہر طرف اس کی مخالفت کرنے والے اٹھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک حقیقی تحریک یہ کرتی ہے کہ وہ وقت کے تمام ان لوگوں کو بے نقاب کر دیتی ہے جو اپنے آپ کو جھوٹ کے پردوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ کوئی اپنے جہل پر علم کا مصنوعی پردہ ڈالے ہوئے ہوتا ہے۔ کوئی اپنی بے دانشی کے اوپر دانش مندی کا فرضی مینار کھڑا کیے ہوئے ہوتا ہے۔ کوئی صرف پیچھے کی صف میں بیٹھنے کے قابل ہوتا ہے مگر وہ حالات سے فائدہ اٹھا کر آگے کی گدی پر قابض ہو جاتا ہے۔ کوئی حقیقۃً مخرب قوم ہوتا ہے مگر خوب صورت الفاظ بول کر اپنے لیے معمار قوم کا خطاب حاصل کر لیتا ہے۔

ایک زندہ تحریک ایسے لوگوں کے لیے ایسی ہی ہے جیسے سونے کے طمع کیے ہوئے برتن لیے آگ کی آنچ۔ آنچ پر آتے ہی اوپر کا طمع اڑ جاتا ہے۔ اسی طرح ایک زندہ تحریک ایسے تمام لوگوں کو اکسپوز (expose) کر دیتی ہے جن کی اصل کچھ ہو اور ظاہری طور پر وہ کچھ بنے ہوئے ہوں۔

کسی تحریک کی مخالفت اس کی زندگی کا اعتراف ہے۔ تحریک کی مخالفت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ باطل پر ضرب لگانے میں کامیاب ہو چکی ہے۔

مخالفت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے اس کی مطلوب قسم۔ یہ حق کے دفاع کے لیے عمل میں لائی جاتی ہے۔ مخالفت کی دوسری غیر مطلوب قسم وہ ہے جو خود اپنی ذات کے دفاع میں کی جاتی ہے۔ آدمی دیکھتا ہے کہ فلاں تحریک اس کو بے زمین کر رہی ہے۔ اس لیے وہ اس کا مخالف بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یا خود پردہ میں رہ کر کچھ دوسرے لوگوں کو اکسا دیتا ہے کہ وہ اس کی مخالفت کی مہم چلائیں۔ پہلی قسم کی مخالفت پیغمبروں کی سنت ہے اور دوسرے قسم کی مخالفت صرف شیطان کی سنت۔

مخالفت بے اثر

۱۲ فروری ۱۹۹۲ کو جناب عبدالقادر بٹ ایم اے (ڈوڈہ، کشمیر) سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر غلام نبی میر (نالی بونجوہ، ڈوڈہ، کشمیر) کو پچھلے سال انھوں نے الرسالہ دکھایا۔ وہ کچھ لوگوں کے مخالفانہ پروپگنڈے سے متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے کہا کہ اس کا لکھنے والا انڈیا گورنمنٹ کا پیڈ ایجنٹ (paid agent) ہے۔ وہ مسلمانوں کو بزدلی سکھاتا ہے۔ ایسے رسالہ کو پڑھنا مجھے پسند نہیں۔

تاہم عبدالقادر صاحب ان سے الجھے نہیں۔ اس سخت تبصرہ کے باوجود وہ ان کو الرسالہ دیتے رہے۔ اس طرح تقریباً چھ مہینے گزر گئے۔ اب جب کہ عبدالقادر صاحب دہلی آرہے تھے۔ ڈاکٹر غلام نبی صاحب نے ان سے کہا کہ تم دہلی جارہے ہو، وہاں الرسالہ کے دفتر میں میرا نام خریداری کے رجسٹر میں درج کرادو۔ تاکہ الرسالہ برابر مجھ کو ملتا رہے۔ میں اس کا ایک شمارہ بھی کھونا نہیں چاہتا۔

چند مہینے الرسالہ پڑھنے کے بعد ان کا ذہن بالکل صاف ہوگیا۔ ان کے تمام شبہات ختم ہوگئے۔ حتی کہ الرسالہ ان کا پسندیدہ پرچہ بن گیا۔ انھوں نے اپنی کشمیری زبان میں الرسالہ کے بارہ میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا: یہ چھو واحد طریق یُس مسلمانن سہی رہنمائی کرن چھو۔ لگمت واقعی چھٹی یم رسالہ پڑھنس لایکھ (یہی واحد طریقہ ہے جس سے کہ مسلمانوں کو صحیح رہنمائی کی جارہی ہے۔ واقعی یہ رسالہ پڑھنے کے لائق ہے)

ڈاکٹر غلام میر کا ابتدائی تاثر الرسالہ کے کچھ مخالفین کے پروپگنڈوں کی وجہ سے تھا۔ مگر جب انھوں نے خود باقاعدہ طور پر الرسالہ کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب محض جھوٹے پروپگنڈے ہیں۔ الرسالہ تمام تر قرآن وسنت کی بنیاد پر چلایا جارہا ہے۔ اس میں عین اسلام کی بات پیش کی جارہی ہے ـــــ اس طرح کے ہزاروں آدمی ہیں جو ابتداءً غلط پروپگنڈے سے متاثر تھے۔ مگر براہ راست واقفیت کے بعد وہ الرسالہ کے گرویدہ ہوگئے۔

سورج کو تاریک بتانے والے لوگ ممکن ہے کہ کچھ اندھوں کو غلط فہمی میں ڈال دیں۔ مگر وہ آنکھ والوں کو بدظن کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

نظریاتی خلا

۱۹۹۱ کے خاتمہ کے ساتھ سوویت یونین کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس سیاسی خاتمہ کے ساتھ اشتراکیت (کمیونزم) کا فکری سحر بھی ختم ہوگیا۔ فکری سحر کے خاتمہ کی مختلف علامتوں میں سے ایک عبرت انگیز علامت یہ ہے کہ ولادیمیر لینن کے دیو قامت مجسمے جو اس سے پہلے اشتراکی شہریوں کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس دلاتے تھے، اب وہ انھیں اشتراکی شہریوں کے ہاتھوں ذلت کے ساتھ گرائے جارہے ہیں۔

۱۹۹۱ کے خاتمہ کے مہینوں میں ہر جگہ اسی کا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں ہر اخبار اور ہر میگزین میں ایسے مضامین آرہے تھے جن کا عنوان ہوتا تھا ــــــــ سوویت یونین کا انہدام (The collapse of Soviet Union)

اس کے بعد ہر طرف یہ کہا جانے لگا کہ اب دو قطبی دنیا (bi-polar world) کا دور ختم ہوگیا اور اب ایک قطبی دنیا (uni-polar world) کا دور شروع ہو چکا ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ۹ جنوری ۱۹۹۲ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ صدر امریکہ مسٹر جارج بش ٹوکیو میں ایک اسٹیٹ ڈنر پر تھے کہ وہ اپنی کرسی سے گر پڑے۔ ٹائمس آف انڈیا (۹ جنوری ۱۹۹۲) کی سرخی کے الفاظ یہ تھے :

Bush collapses at Tokyo reception.

روس میں کمیونزم کا خاتمہ : لینن کا مجسمہ زمین پر گرا ہوا ہے

راقم الحروف کا خیال ہے کہ پہلا انہدام اگر حقیقی تھا تو دوسرا انہدام علامتی ہے۔ سوویت یونین عملاً منہدم ہو چکا۔ امریکہ بھی امکانی طور پر اپنے انہدام کے قریب ہے۔ جارج بش کا گرنا امریکہ کے گرنے کی علامتی پیشین گوئی ہے۔

ایک مبصر نے بجا طور پر لکھا ہے کہ تقریباً ۳۰ سال پہلے سابق روسی وزیر اعظم خروشچیف نے اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ کمیونسٹ سرمایہ داری نظام کو دفن کر دیں گے :

Communists would bury capitalism..

مگر کمیونسٹ نظام خود اپنے داخلی تضادات (inner contradictions) کا شکار ہو کر منہدم ہو گیا۔ اب دوسرے سپر پاور امریکہ کے لیے متحدہ یورپ اور جاپان زبردست اقتصادی خطرہ بن کر ابھرے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو انجام سرخ سپر پاور کا ہو چکا ہے وہی انجام سفید سپر پاور کا آئندہ ہونے والا ہے۔

انسان بنیادی طور پر ایک توجیہہ پسند مخلوق ہے۔ وہ لازمی طور پر ایک آئیڈیالوجی (نظریہ) چاہتا ہے جس کے ذریعہ وہ کائنات کی توجیہہ کرے۔ جس کے ذریعہ وہ یہ متعین کر سکے کہ وہ کیا ہے اور تاریخ میں اس کا مقام کیا ہے۔ اس قسم کی ایک آئیڈیالوجی کے بغیر آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔

امریکہ کے پاس انسان کو دینے کے لیے اس قسم کی کوئی آئیڈیالوجی نہیں۔ اس کا واحد ایڈوانٹج یہ ہے کہ اس کے پاس ایک قابل عمل معاشی ڈھانچہ (workable system) ہے۔ سوویت یونین کا معاشی ڈھانچہ اس کے مقابلہ میں ناقابل عمل (unworkable) تھا۔ اور یہی اصلاً اس کے انہدام کا سبب بنا۔

تاہم سوویت یونین کے پاس ایک آئیڈیالوجی تھی۔ یہ اگرچہ ایک جھوٹی آئیڈیالوجی (false ideology) تھی۔ مگر اس کے ذریعہ انسان کو ایک فرضی تسکین حاصل تھی کہ وہ اس پوزیشن میں ہے کہ زندگی اور کائنات کی توجیہہ کر سکے۔ سوویت یونین کے انہدام سے یہ بھرم ختم ہو گیا۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جنوری ۱۹۹۲) میں ایک تجزیہ چھپا ہے، اس کا عنوان ہے ——— سوویت یونین کے انہدام کے بعد :

The aftermath of the Soviet colapse

تجزیہ نگار نے بجا طور پر لکھا ہے کہ سوویت یونین کا انہدام سادہ طور پر صرف ایک ایمپائر کا انہدام نہیں۔ یہ درحقیقت جدید انسان کے سوچنے کے ڈھانچہ (structure of thinking) میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تاریخ کے عمل (course of history) کے بارہ میں ہمارے نقطۂ نظر (outlook) کو بدل دینے والا واقعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی ایمپائر کے انہدام کے بعد عالمی سطح پر ایک نظریاتی خلا (ideological vacuum) پیدا ہو گیا ہے۔ اب دنیا کے سامنے عملاً کوئی نظریہ حیات سرے سے موجود ہی نہیں۔

سوویت یونین کا عملی انہدام اور امریکہ کا امکانی انہدام اب اس درجہ کو پہنچ رہا ہے جس کو ایک مغربی عالم نے جدید تہذیب کا انہدام (collapse of civilization) سے تعبیر کیا ہے۔ انسانی دنیا میں عالم گیر نظریاتی خلا کا دور آچکا ہے یا کم از کم، وہ بہت جلد آنے والا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ٹائمس آف انڈیا کے مذکورہ تجزیہ نگار نے اپنا مضمون ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ اشتراکیت کو گرہن لگنے کے بعد لازمی ہے کہ کوئی متبادل نظریہ اٹھے جو ان مسائل کا حل بتائے جو آج انسانیت کو گھیرے ہوئے ہیں :

The ideological vacuum left by the eclipse of socialism is bound to lead to alternative ideological formulations which would assume new relevance in the context of the pressing problems and challenges faced by humanity today.

یہاں خود حالات میں وہ اشارہ موجود ہے جو بتاتا ہے کہ وہ متبادل نظریہ کون سا ہو سکتا ہے جو انسانیت کو اس کی مطلوب چیز دے سکے۔ سوویت یونین میں بسنے والے انسان کو بیک وقت دو تلخ تجربے ہوئے۔ ایک، کمیونسٹ ڈکٹیٹر شپ کی طرف سے پیش آنے والا تشدد۔ دوسرا، مذہب کو اختیار کرنے کے جرم میں مسلسل تعذیب۔ سوویت انسان نے تشدد کی بنا پر کمیونزم کو چھوڑ دیا۔ مگر اسی تشدد کے باوجود وہ مذہب کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوا۔

مذہب انسان کی فطری طلب ہے، اور جو چیز فطری طلب ہو اس کو چھوڑنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

اپنا مسئلہ

بعض باتیں قواعد زبان کے اعتبار سے بظاہر درست نظر آتی ہیں مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بالکل غلط ہوتی ہیں۔ اس کی ایک مثال لیجئے۔ "انقلابی اسلام" کے ایک علم بردار نے اپنے نظریہ کو اس سوال و جواب کی صورت میں بیان کیا ہے :

زمین کس کی ہے

اللہ کی

پھر زمین میں کس کا قانون چلنا چاہیے

اللہ کا

اس نظریہ نے بہت سے مسلم نوجوانوں کو اس فریب میں ڈال دیا کہ ہمارا مقصد "عالمی حکومتِ الٰہیہ" قائم کرنا ہے۔ وہ بندوق لے کر نکل پڑے ہیں کہ لوگوں کو مار مار کر خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری کریں۔ ان میں سے جن لوگوں کے لیے بندوق سنبھالنے کے مواقع نہیں ہیں، وہ الفاظ کو بندوق کی گولی کا بدل بنائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ ایک طبع زاد نظریہ ہے۔ شاعرانہ مضمون کی طرح کچھ لوگوں نے خود ساختہ طور پر اس کو گھڑ لیا ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں۔

قرآن کے مطابق، زمین پر خدا کی حکومت اوّل دن سے قائم ہے، اسے قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کی روشنی میں غور کیجئے تو صحیح بات یہ قرار پائے گی :

زمین پر کس کا حکم چل رہا ہے

اللہ کا

پھر آدمی کو کس کا حکم ماننے چاہیے

اللہ کا حکم ماننا چاہیے

حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ زمین کا نہیں، مسئلہ اپنی ذات کا ہے۔ ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمین و آسمان کی طرح خدا کے حکم کا پابند بنائے۔ وہ اپنی ذات کو اسی طرح خدا کا مطیع بنا لے جس طرح بقیہ کائنات خدا کی مطیع بنی ہوئی ہے (آل عمران ۸۳)

مسئلہ کا حل

مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۸۵-۱۹۰۸) اپنی آخر عمر تک ماہنامہ 'برہان' (دہلی) کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے ایک بار اپنے اداریہ کے صفحات میں لکھا تھا:

"ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی جو معاشیات میں ڈاکٹر ہیں، وہاں مسلمان طلباء کی انجمن کی دعوت پر اسلام پر مختلف مراکز میں لکچر دینے کی غرض سے امریکہ گئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں شکاگو سے ان کا ایک خط آیا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں: ہندوستان میں گزشتہ پچیس برس میں ہم نے (مسلمانوں نے) احتجاج کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن یہاں کے مسلمان مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ اس مدت میں ہم نے کوئی تعمیری (positive) اور مثبت کام بھی کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو وہ کیا ہے؟ یہ سن کر سخت شرمندگی ہوتی ہے' آپ ازراہِ کرم اس پر توجہ کیجئے۔ راقم الحروف نے اس کے جواب میں ڈاکٹر نجات اللہ صاحب کو لکھا ہے کہ آپ نے یہ وہی بات لکھی ہے جس کو میں شروع سے کہتا اور لکھتا چلا آرہا ہوں، لیکن افسوس، یہاں کے مسلمانوں میں اجتماعی اور قومی سطح پر مثبت اور تعمیری کام کرنے کا کوئی جذبہ ہی نہیں ہے' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لیڈرشپ بالکل نکمی اور ناکارہ ہے' اس کے پاس نہ دل ہے نہ دماغ۔ ہواؤں پر اڑتی اور جلسوں جلوسوں پر جیتی ہے۔"

(برہان، دہلی، اکتوبر ۱۹۷۰ء)

ان سطروں کے لکھے اور چھپے ہوئے ۲۰ سال ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ وقت قریب آگیا جبکہ "۲۵ سال" کی کہانی کو "۵۰ سال" کی کہانی کا عنوان دیا جاتے مگر وہی صورت حال بدستور ابھی تک باقی ہے۔ اس میں اضافہ کی نشاندہی تو کی جاسکتی ہے مگر اس میں کمی کی کوئی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔

یہ بات بذات خود صحیح ہے کہ لیڈرشپ کے ناکارہ ہونے کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے مگر یہاں دوبارہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان ایسے لوگ آخر لیڈر کیسے بن جاتے ہیں۔ جو نکمے اور ناکارہ ہوں۔ ایسے لوگوں کو ملت کے کوڑا خانہ میں جگہ ملنی چاہیئے نہ یہ کہ ملت کے قیادتی اسٹیج پر انھیں بٹھایا جاتے۔

اس کی وجہ مسلم سماج کی بے شعوری ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بے شعوری کی سطح پر جی رہے ہیں

وہ صحیح اور غلط میں تمیز نہیں کر پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ جو آدمی زیادہ جوشیلی تقریر کرتا ہے۔ جو بڑے بڑے الفاظ بولنا جانتا ہے۔ جو جھوٹی آرزوؤں اور فرضی خوبصورت فہمیوں میں جینے کی خوراک فراہم کرتا ہے، اس کے پیچھے ان کی بھیڑ دوڑ پڑتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی بے شعوری کی بنا پر لفظ اور حقیقت میں فرق کرنے کی تمیز نہیں رکھتی۔

ایسی حالت میں کرنے کا پہلا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو باشعور بنایا جائے۔ جس دن مسلمان ایک باشعور گروہ بن جائیں گے اسی دن ناکارہ قیادت اپنی زمین کھو دے گی اور پھر وہ اپنے آپ ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اگر قیادت کو ختم کرنا ہے تو مسلمانوں کے بے شعور پن کو ختم کیجئے۔ اس مسئلہ کا حل بالواسطہ طریق کار میں ہے نہ کہ براہ راست طریق کار میں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی کے لیے اس کی فطرت سب سے بڑی اور سب سے بہتر رہنما ہے۔ جھوٹے لیڈر آدمی کو اس کی فطرت کے راستہ سے ہٹاتے ہیں اگر یہ نام نہاد لیڈر سامنے نہ رہیں تو ہر آدمی کی فطرت جاگ اٹھے گی، اور جب فطرت زندہ اور بیدار ہو تو کسی رہنما کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں کے سلسلہ میں اس وقت کرنے کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ یہ شکوہ کیا جائے کہ ان کے درمیان تعمیری اور مثبت قسم کی لیڈرشپ نہیں ہے۔ بلکہ اصل کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر تعمیری اور مثبت ذہن بنایا جائے تاکہ ان کے درمیان تعمیری اور مثبت لیڈرشپ ابھر سکے۔

حدیث میں آیا ہے کہ: کما تکونون کذلك یؤمّر علیکم۔ یعنی جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے لیڈر ہوں گے۔ موجودہ زمانہ میں جو غیر صحیح لیڈرشپ مسلمانوں کے اوپر مسلط ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مسلمان کا مزاج غیر صحیح ہے۔ اگر مزاج صحیح ہو جائے تو ان کے درمیان لیڈرشپ بھی صحیح قسم کی ابھرے گی۔ ہمارے کرنے کا اصل کام مزاج سازی یا ذہن تعمیر ہے۔ بقیہ چیزیں جو ہم چاہتے ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں۔ اس بنیادی کام کے بغیر ان کو حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک سفر

۶ اکتوبر ۱۹۹۱ کی شام کو مجھے ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا تھا۔ دہلی سے چل کر روم اور مالٹا اور قاہرہ پہنچنا تھا اور وہاں سے پھر دہلی واپس آنا تھا۔ آج کا اخبار آیا تو اس کے پہلے صفحہ کی اس خبر پر نظر اٹک گئی کہ ـــــ ہوائی حادثہ میں ۱۳۲ آدمی ہلاک ہو گئے۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ انڈونیسی ایر فورس کے ایک جہاز میں اڑان بھرنے کے صرف تھوڑی دیر بعد دھماکہ ہوا۔ وہ جکارتا کی ایک بلڈنگ پر گر پڑا۔ اس کے تمام ۱۳۲ مسافر جل کر مر گئے:

An Indonesian air force plane crashed and exploded shortly after take-off today, killing all 132 people on board.

ایک تاجر کے بارہ میں ایک بار میں نے پڑھا کہ وہ کسی سفر پر جانے والا تھا۔ عین اسی دن ایک ہوائی حادثہ کی خبر ملی۔ اس نے اپنا سفر منسوخ کر دیا۔ لیکن اگلے روز عین اس وقت اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی جب کہ وہ اپنے محفوظ مکان میں کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا صبح کی چائے پی رہا تھا۔

اگر ہم انسانی جہاز میں سفر نہ کریں تب بھی ہم ایک خدائی جہاز کے مسافر ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا جسم ہے جس میں بیٹھ کر ہماری شخصیت زندگی کا سفر طے کر رہی ہے۔ جس لمحہ خدا کا حکم ہوگا جسم کی یہ سواری ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور اس کے بعد ہماری شخصیت (روحانی وجود) اس سے نکل کر خدا کی عدالت میں حاضر کر دیا جائے گا۔ آدمی کو اگر اس حقیقت کا احساس ہو تو اس کو اپنے پرسکون مکان میں بیٹھنا بھی اسی طرح پرخطر دکھائی دینے لگے جس طرح کسی سمندری یا ہوائی سواری میں سفر کرنا۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۱ کی شام کو عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر دہلی ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوا۔ میرے ساتھ ثانی اثنین بھی تھے۔ ہماری گاڑی مانوس راستوں سے گزرتی ہوئی پرسکون غور پر آگے بڑھ رہی تھی۔ اور میرے ذہن میں خیالات کا طوفان برپا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ میرا دماغ ایک قسم کی کنورٹنگ مشین ہے جس میں دنیا کا ہر غم آخرت کے غم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ میرا یہ مزاج اتنا بڑھا ہوا ہے کہ میرا دماغ خوشی کے واقعہ کو بھی غم میں بدلتا ہے، تاکہ دوبارہ اس کو غم آخرت میں ڈھال سکے۔ دنیا میرے لئے ایک تجربۂ غم تھی۔ کاش اللہ اپنی رحمت سے آخرت کو میرے لئے تجربۂ مسرت

بنادے۔

ایر پورٹ کے اندر داخل ہوا تو وہاں کی دنیا حسب معمول نظر آئی۔ یہاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں کوئی مقیم نہ تھا۔ یہاں کا ہر شخص مسافر تھا۔ میں نے لوگوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کی۔ کچھ لوگوں کی بات چیت کو سنا۔ میرے دل نے کہا کہ ان لوگوں کو سفر حیات کی خبر ہے۔ مگر انھیں سفر موت کی کوئی خبر نہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے آغاز کو جانیں مگر وہ اپنے انجام کے بارہ میں بالکل بے خبر بنے ہوئے ہوں۔

دہلی سے الیتالیا کی فلائٹ ۸۷ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ سروس ہر اعتبار سے اچھی تھی۔ جہاز کے اندر الیتالیا کا میگزین ULISSE پڑھا۔ ایک مضمون میں یہ مقولہ نقل کیا گیا تھا کہ ــــ ایک سفر کا خاتمہ دوسرے سفر کا آغاز ہے:

The end of one journey is the start of another.

میگزین میں یہ مقولہ الیتالیا کے کمرشیل ہوائی جہازوں پر چسپاں کیا گیا تھا جو ہر سفر کے خاتمہ پر دوسرے سفر کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ مقولہ زیادہ بہتر طور پر انسانی زندگی کے اوپر چسپاں ہوتا ہے۔ جب آدمی کی موت آتی ہے اور اس کی ایک زندگی بظاہر ختم ہو جاتی ہے تو یہ خاتمہ سادہ معنوں میں صرف خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ ایک وسیع تر دور حیات کا آغاز ہوتا ہے۔

یہ جہاز بوئنگ ۷۴۷ تھا۔ اس کے اندر ۱۹۲ سیٹیں تھیں۔ جہاز کا سفر موجودہ زمانہ میں ایک عام ذریعہ سفر بن چکا ہے۔ مگر میں جب بھی ہوائی جہاز میں سفر کرتا ہوں تو میرے اندر سخت استعجاب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی عجیب رحمت ہے کہ اس نے موجودہ دنیا میں ایسے امکانات رکھے جو ہوائی جہاز کی صورت میں ڈھل جائیں اور انسان کے سفر کو حیرت ناک حد تک تیز رفتار بنا دیں۔

خدا نے ایسا نہیں کیا کہ وہ بنے بنائے ہوائی جہاز انسان کو دیدے۔ بلکہ اس نے زمین میں ہوائی جہاز کے "امکانات" رکھے اور یہ انسان کے اوپر چھوڑ دیا کہ سیکڑوں سال کی تحقیق اور جستجو کے بعد وہ ایک واقعی جہاز بنا سکے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو انسان کے لئے اکتشافی طریقہ

(discovery method) پسند ہے۔ یہی طریقہ اس نے دین میں بھی رکھا ہے۔ دین اپنی حقیقت کے اعتبار سے اتنا واضح ہے کہ اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے (لیلھا کنھارھا) مگر اللہ نے دین پر التباس (الانعام ۹) کا پردہ ڈال دیا ہے۔ یہ ایک تدبیر ہے جس کا مقصد انسان کے ذہن کو متحرک کرنا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ آدمی اپنی فکری قوتوں کو عمل میں لاکر اس پردہ کو پھاڑے اور دین کو ذاتی معرفت کی سطح پر دریافت کرے۔

پچھلی رات میں دہلی میں سو نہیں سکا تھا۔ جہاز میں داخل ہوا تو نیند اور تکان کا سخت غلبہ تھا۔ چنانچہ جلد ہی نیند آگئی۔ میں لیٹ گیا اور گہری نیند سوتا رہا۔ دہلی سے روم کی پرواز مسلسل ۹ گھنٹے کی ہے۔ مگر اس کا بڑا حصہ سونے میں گزر گیا۔ اور ایک تھکا دینے والا سفر بآسانی طے ہو گیا۔

جسم اس طرح خودکار نظام کے تحت کھوئے ہوئے کی تلافی کرتا ہے۔ تلافی (compensation) فطرت کا ایک مستقل اصول ہے۔ مثلاً کسی آدمی کے جسم سے اس کا ایک گردہ نکال دیا جائے تو دوسرا گردہ اپنے آپ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ تنہا پورے جسم کی ضرورت کو پوری کر سکے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کا پسندیدہ طریقہ کیا ہے۔ وہ تلافی مافات کا طریقہ ہے۔ اس کے مطابق اگر کوئی قوم دوسری قوموں سے پچھڑ جائے تو اس کے لئے فطری طریقہ یہ ہوگا کہ وہ سب سے پہلے اپنی کمی کی تلافی کرے۔ کمی کی تلافی کے بغیر اقدام کرنا فطرت کے مقررہ طریقہ کے خلاف ہے۔ اور جو لوگ فطرت کے طریقہ کے خلاف عمل کریں ان کا ناکام ہو جانا یقینی ہے۔

۹ گھنٹہ کی مسلسل پرواز کے بعد جہاز ۷ اکتوبر کی صبح کو روم میں اتر گیا۔ لینڈنگ نہایت ہموار تھی۔ جس کانفرنس میں مجھے شرکت کرنا ہے وہ اگرچہ مالٹا میں ہے مگر اس کے نمائندہ ڈاکٹر پالومبی (Dr Leonardo Polombi) دو آدمیوں کے ساتھ روم ایئرپورٹ پر ہماری رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ یہ کانفرنس ویٹیکن کے ماتحت ایک اطالوی ادارہ (CXomunity of S. Egidio) کی طرف سے کی جا رہی ہے۔

ہمارے اخبارات و رسائل میں ویٹیکن اور دوسرے مسیحی اداروں کے بارہ میں صرف یہ چھپتا ہے کہ وہ اسلام کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ مگر طریق کار کے اعتبار سے ان کے یہاں جو اعلیٰ نمونہ ہے

اس سے مسلمانوں کو باخبر نہیں کیا جاتا۔ یہ لوگ جس غیر معمولی نظم اور باقاعدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں اس سے اب تک کوئی سبق نہیں لیا گیا۔ حالاں کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دشمن کے اندر بھی اگر کوئی ہنر ہے تو اس کو اس سے سیکھنے کی کوشش کرو۔

۶ اکتوبر ۱۹۹۱ کو فجر کی نماز میں نے نظام الدین (دہلی) کی قریش مسجد میں پڑھی تھی۔ ۷ اکتوبر کو فجر کی نماز روم ایر پورٹ کے وی آئی پی لاونج میں پڑھی۔ مسجد کے مقدس ماحول میں نماز پڑھنے کے بے شمار فائدے ہیں۔ مگر ایک غیر مسجد میں یا ایک نئے مقام پر نماز پڑھنا ایک ایسا انوکھا تجربہ ہے۔ جس کو لفظوں میں بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ یہ وہ خصوصی لمحہ ہے جب کہ بندہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ میں ایک ایسے مقام پر جھک کر سجدۂ اعتراف کر رہا ہوں جہاں مجھ سے پہلے شاید کسی انسان نے سجدۂ اعتراف پیش نہیں کیا۔ یہ ایک ایسا احساس عبدیت ہے جس کا تجربہ عام حالات میں نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری پہلی منزل روم تھی۔ روم میں اگلا جہاز کافی دیر کے بعد تھا۔ اس طرح ہم کو یہاں چھ گھنٹے سے زیادہ مل رہے تھے۔ ایر پورٹ پر کانفرنس کے جو منتظمین ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے، ان سے ہم نے کہا کہ روم میں ہم خاص طور پر دو چیزیں دیکھنا چاہتے ہیں، ایک ویٹیکن اور دوسرے یہاں کا اسلامی مرکز اور مسجد۔ وہ بخوشی اس پر راضی ہو گئے۔ ہمارے پاس اٹلی کا ویزا نہیں تھا۔ عام حالات میں اب ویزا حاصل کرنا ہمارے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ مگر انھوں نے فوراً کارروائی کر کے ہمارا ویزا حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ ہم کو لیکر شہر کی طرف نکلے۔ ویٹیکن سے تعلق رکھنے والوں کو یہاں خصوصی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

روم کے مختلف علاقوں سے گزارتے ہوئے وہ ہم کو ویٹیکن میں لے گئے۔ اس طرح ہم نے روم کو بھی کم از کم ایک حد تک دیکھ لیا۔ ویٹیکن کو اندر اور باہر سے پوری طرح دیکھا۔ یہ ایک مربع کلومیٹر سے بھی کم رقبہ میں واقع ہے۔ پوپ کی رہائش گاہ بھی یہیں ہے۔ سینٹ پیٹر (پطرس) کا مقبرہ اس کا سب سے زیادہ مقدس حصہ ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ سینٹ پیٹر کا بڑا مجسمہ ہے۔ لوگ اس کے پاؤں کو احترام کے ساتھ چھوتے ہیں اور اس کو چوم رہے ہیں۔

ویٹیکن ساری دنیا کے مسیحیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ وہ ہر طرف مجسموں سے بھرا ہوا ہے۔ مسیح اور مریم اور فرشتوں کے مجسموں سے لے کر بعد کے مسیحی اکابر اور مختلف زمانوں کے پوپ کے مجسمے

جگہ جگہ لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سنگ مرمر کا ایک مجسمہ مائیکل انجلو کا بنایا ہوا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں مریم کو بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اور ان کے دونوں پیروں پر ایک دبلا اور مردہ جسم بیچارگی کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ یہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت مسیح کا مردہ جسم ہے جس کو صلیب دئے جانے کے بعد حضرت مریم نے اٹھا لیا تھا۔ مزعومہ خدا کی یہ بے کس تصویر بھی کیسی عجیب ہے۔

ویٹیکن کو دیکھ کر یہ تاثر ذہن میں نہیں آتا کہ مذہب کسی خدا پر مبنی نظریہ کا نام ہے۔ اس کے برعکس اس کو دیکھنے سے یہ تاثر ذہن میں آتا ہے کہ مذہب ایک ایسا نظریہ یا عقیدہ ہے جو انسانی شخصیتوں کے تقدس پر قائم ہے۔

ویٹیکن (Vatican) روم کی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ یہاں سینٹ پیٹر (پطرس) کی قبر ہے۔ اور پوپ کی قیام گاہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کیتھولک عیسائیوں کی کئی مقدس اور متبرک چیزیں یہاں کے میوزیم میں رکھی ہوئی ہیں۔

ویٹیکن کا رقبہ صرف ۱۰۸ مربع ایکڑ ہے۔ اس کے باشندوں کی مجموعی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ مگر اس چھوٹی سی دنیا میں ایک مکمل ریاست قائم ہے۔ یہ مذہبی ریاست قانونی طور پر ۱۹۲۹ میں مسولینی کے زمانہ میں قائم ہوئی۔ جس معاہدہ کے تحت اس کا قیام عمل میں آیا اس کو معاہدۂ لیتران (Lateran Treaty) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت پوپ یا ویٹیکن حکومت کو اندرونی طور پر مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ گویا ریاست کے اندر ایک ریاست ہے تاہم وہ اس کی پابند ہے کہ وہ اٹلی کی حکومت کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔

۱۹۲۹ کے معاہدہ کو دیکھئے تو بظاہر محسوس ہوگا کہ ویٹیکن اپنے آپ کو بہت چھوٹی حیثیت پر راضی کر رہا ہے۔ ویٹیکن کا رقبہ ایک مربع کلومیٹر سے بھی کم ہے۔ جب کہ اٹلی کا رقبہ 301,262 مربع کیلومیٹر ہے۔ گویا جغرافی معنوں میں ویٹیکن کو اٹلی کا ایک فیصد سے بھی کم رقبہ حاصل ہے۔

مگر حقائق کبھی الفاظ کے پابند نہیں ہوتے۔ چنانچہ ویٹیکن نے ایک اور پہلو سے اپنی کمی کی تلافی کر لی۔ اٹلی کی ۹۹ فیصد آبادی عیسائی ہے۔ اس اعتبار سے اٹلی کے تمام باشندوں نیز تمام دنیا کے عیسائیوں کے دلوں تک اس کا رقبہ پھیلا ہوا ہے۔ حتی کہ کہا جاتا ہے کہ اپنے انتہائی چھوٹے رقبہ کے باوجود ویٹیکن کو عملاً اٹلی سے بھی زیادہ بڑی حیثیت حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ (ویٹیکن) مسیحی مذہب کی سب سے بڑی

شارخ، کیتھولک چرچ، کا صدر مقام ہے:

Despite its minuscule size, however, Vatican City has been said to possess an influence greater than that of Italy itself, for it is the site of the headquarters of the largest branch of the Christian religion, the Roman Catholic Church. (19/36)

ویٹیکن کی سرکاری زبان لاتینی ہے۔ ویٹیکن کے تمام آفیشل ڈاکومنٹ لاتینی زبان ہی میں تیار کئے جاتے ہیں۔ مگر لاتینی زبان عربی زبان کی مانند نہیں۔ وہ ایک مردہ زبان ہے۔ صرف کچھ اختصاصی علماء ہی اس میں مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ لسانی امور میں اکثر غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر، ۱۹۸۹ میں پوپ کے اسکینڈینیوا کے سفر پر ویٹیکن حکومت نے ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا۔ اس میں سویڈن کے لئے جو قدیم لاتینی لفظ (Sueta) لکھا گیا تھا اس کا تلفظ غلط تھا:

In 1989 the hierarchy was embarrassed when a stamp commemorating Pope John Paul II's trip to Scandinavia misspelled the Latin word for Sweden. (Time, 7-10-1991)

اس قسم کے ناخوشگوار واقعات سے متاثر ہو کر ویٹیکن نے لاتینی زبان کی ایک ڈکشنری خصوصی اہتمام کے ساتھ تیار کرائی ہے۔ اس میں (13,500) نئے الفاظ شامل ہیں۔ اس کی پہلی جلد حال میں چھپی ہے اور دوسری جلد عنقریب چھپنے والی ہے۔ یہ کام ایک پندرہ سالہ ادارہ لیٹن فاؤنڈیشن (Latin Foundation) کے تحت کیا جا رہا ہے۔

اسلام کے سوا دوسرے تمام ادیان کی مذہبی زبان اب کلاسیکل بن چکی ہے۔ یہ صرف اسلام ہے جس کی مذہبی زبان آج بھی مکمل طور پر ایک زندہ زبان ہے۔ یعنی عربی زبان۔

ویٹیکن کو دیکھنے کے بعد ہم روم کی مسجد اور اسلامی مرکز دیکھنے کے لئے گئے۔ یہ مقام ایرپورٹ سے بذریعہ کار پون گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ روم کا ایک پر فضا مقام ہے۔ ویٹیکن میں اندر اور باہر ہر طرف صرف عمارتوں کا ایک پتھریلا جنگل نظر آتا ہے۔ مگر اسلامی مرکز کے چاروں طرف کھلا ہوا علاقہ ہے۔ یہاں دور دور تک درخت اور سبزہ دکھائی دیتا ہے۔

تاہم یہ مرکز ابھی تک زیر تعمیر ہے۔ وہاں نماز قائم نہیں ہو سکی ہے ...... '''، کمیٹی اس کی تعمیر

کرا رہی ہے۔ اس نے مسجد کے اندر داخلہ ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ مرکز کے ذمہ داروں نے ہم کو تحریری اجازت دی۔ اس کے بعد ہمارا تین آدمیوں کا قافلہ اس کے اندر داخل ہو سکا۔

یہ بہت وسیع اور بالکل جدید طرز کی مسجد ہے۔ اس سے متصل عمارتوں میں اسلامی مرکز کے دفاتر قائم ہوں گے۔ رقبہ بھی کافی بڑا ہے۔ حکومت اٹلی نے جب یہاں مسجد اور اسلامی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی اس وقت یہاں کوئی سڑک نہ تھی جو اس کو بقیہ شہر سے جوڑ سکے۔ یہاں کے قانون کے مطابق، اس کے بعد نہایت عمدہ سڑک بنائی گئی جو مسجد سے متصل گزرتی ہے۔ اس سڑک کا نام مسجد روڈ (Viale Della Moschea) ہے۔

۱۹۲۹ میں مسولینی نے ویٹیکن کے لئے لیتران معاہدہ پر دستخط کئے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۰ میں اٹلی میں مقیم افریقی مسلمانوں کا ایک وفد مسولینی سے ملا اور اس سے کہا کہ ہم کو روم میں ایک مسجد بنانے کی اجازت دی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ مسولینی نے اس کا جواب یہ دیا کہ روم عیسائیوں کا مقدس شہر ہے جس طرح مکہ مسلمانوں کا مقدس شہر ہے۔ روم میں مسجد بننا اسی وقت ممکن ہے جب کہ مکہ میں بھی ایک کیتھولک چرچ بن کر کھڑا ہو جائے۔

تاہم روم کے مسلمانوں نے کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عرب پٹرول کی طاقت ظاہر کر دی۔ وہ دور آگیا جب کہ امریکی میگزین نیوز ویک (۱۸ فروری ۱۹۷۴) نے لکھا کہ قدیم زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ تمام سڑکیں روم کو جاتی ہیں۔ مگر اب حالات بدل چکے ہیں۔ آج تمام سڑکیں ریاض کو جا رہی ہیں:

(All roads lead to Riyadh

اٹلی کو عرب پٹرول کی ضرورت پیش آگئی۔ اس اقتصادی منطق نے اٹلی کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ دو طرفہ گفت و شنید کے دوران ۱۹۷۳ میں سعودی حکمراں شاہ فیصل نے اٹلی کی حکومت سے یہ یقین دہانی حاصل کر لی کہ وہ روم میں مسجد بنانے کی اجازت دے دے گی۔ اسی کے ساتھ پوپ پال ششم نے بھی یقین دلایا کہ وہ مسجد کے پروجیکٹ میں مداخلت نہیں کریں گے۔ اس کے بعد سائٹ کی تلاش ہوئی۔ آخر کار ایک مقام پر ۳۰ ہزار مربع میٹر کا رقبہ مسجد اور اسلامک سنٹر کے لئے مختص کر دیا گیا اور ۱۹۸۳ میں وہاں کام شروع ہو گیا۔ اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل پر پچاس ملین ڈالر خرچ ہوں گے۔ اٹلی میں تقریباً

چار لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ مسجد کے اندر دو ہزار آدمیوں کے لئے نماز پڑھنے کی گنجائش ہوگی۔ روم میں ایک ہزار عیسائی چرچ اور یہودیوں کے آٹھ سینا گاگ ہیں۔ اب ایک باقاعدہ مسجد بھی وہاں تعمیر ہوگئی ہے۔ دوسری مسجد میلان میں ہے۔

۱۹۳۰ میں جو چیز بظاہر ناممکن تھی وہ آج واقعہ بن کر شاندار طور پر روم کے اندر کھڑی ہوئی ہے۔ خدا کی دنیا میں ہر ناممکن کو ممکن بنانے کے مواقع ہیں۔ بشرطیکہ سنت الٰہی کے مطابق اس کا انتظار کیا جائے۔

روم میں میرے رہنما ڈاکٹر لیونارڈو تھے۔ وہ پختہ عیسائی ہیں اور ویٹیکن سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے انتہائی ذوق وشوق کے ساتھ مجھ کو روم کی سیاحت کرائی۔ انھوں نے جس دلچسپی کے ساتھ مجھ کو ویٹیکن دکھایا ٹھیک اسی دلچسپی کے ساتھ انھوں نے روم کی مسجد اور اسلامک سنٹر کو بھی دکھایا۔

میرے تجربہ کے مطابق، مسلمانوں کے اندر اس قسم کا کردار موجود نہیں۔ اور اس کا واحد سبب دعوتی مزاج کا فقدان ہے۔ داعی اور مبلغ عین اپنے مزاج کے تحت دوسروں میں دلچسپی لیتا ہے۔ وہ دوسروں کی پوری رعایت کرتے ہوئے ان سے معاملہ کرتا ہے۔ غیر داعی کا مزاج اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ داعی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جانتا ہے اور غیر داعی صرف اپنے آپ کو۔

روم میں اگرچہ میری ملاقات کسی اردو داں سے نہیں ہوئی۔ تاہم مجھے معلوم ہوا کہ اٹلی میں اردو داں عیسائی موجود ہیں۔ انھوں نے خود اٹلی میں اردو کی تعلیم حاصل کی ہے۔

مسیحی چرچ مکمل طور پر ایک تبلیغ اورینٹڈ ادارہ ہے۔ اس کے یہاں ہر قسم کی تبلیغی سرگرمیاں جدید ترین معیار پر پائی جاتی ہیں۔ اسی میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آدمیوں کو تمام دنیا کی زبانیں پڑھاتے ہیں۔ مسیحی چرچ کے پاس کثیر تعداد میں ایسے قابل افراد موجود ہیں جو ہر زبان میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مالٹا کی کانفرنس میں کئی ایسے پادری تھے جو روانی کے ساتھ عربی زبان بولتے تھے۔ حتی کہ اپنے حلیہ، اپنے لباس اور اپنی عادات میں بھی وہ عرب مسلمان نظر آتے تھے۔ وہ السلام علیکم، الحمد للہ، ماشاء اللہ وغیرہ الفاظ اس طرح بولتے تھے جیسے کہ ایک مذہبی مسلمان بولتا ہے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں نیپلز (اٹلی) میں مسیحی حضرات نے ایک ادارہ قائم کیا۔ ۷ اپریل ۱۷۳۲ کو پوپ کلیمنٹ دوازدہم نے اس ادارہ کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرلیا اور اس کی سرپرستی کرتے ہوئے جنوبی اٹلی میں اس کے لئے ایک جائداد وقف کر دی۔ اس کے بعد اس میں مزید اوقاف

کا اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ یہ ادارہ مستحکم اور خود کفیل ہوگیا۔ اس کا موجودہ نام اورینٹل یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، نیپلز ہے۔ یہ یورپ میں علوم مشرقی کی تعلیم کا قدیم ترین مرکز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تمام مشرقی زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔

اردو زبان کی تعلیم کا آغاز اسی ادارہ میں انیسویں صدی میں ہوا۔ یہاں باقاعدہ طور پر اردو کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس وقت سے وہ باقاعدہ طور پر کام کر رہا ہے۔ اس کے طلبہ زیادہ تر وہ مسیحی نوجوان ہوتے ہیں جو مسیحیت کی تبلیغ کو بطور کیریر اختیار کرتے ہیں اور جن کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اردو خواں دنیا میں مسیحیت کا پیغام پہنچائیں گے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران پروفیسر اجیت سنگھ اس ادارہ میں اردو کے استاد تھے۔ ۱۹۶۰ میں ڈاکٹر اقتدار احسن یہاں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ میں ڈاکٹر رحیم رضا نے ان کی جگہ سنبھالی۔

اٹلی میں (دوسری عالمی زبانوں کے ساتھ) اردو کی تعلیم کا یہ انتظام حکومت کے تعلیمی نظام کے تحت نہیں ہے بلکہ چرچ کے تعلیمی نظام کے تحت ہے۔ اس کا مقصد مشنری عیسائیوں کو اردو داں بنانا ہے۔ تاکہ وہ اردو داں مسلمانوں کے درمیان عیسائیت کا پیغام پہنچا سکیں۔ مسلمان فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلام عالمی مذہب ہے اور حضرت مسیح صرف "بنی اسرائیل کی بھیڑوں" کے لئے بھیجے گئے تھے۔ مگر عملاً آج معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مسیحیت عالمی تبلیغ کے وسیع ترین منصوبہ پر عمل پیرا ہے، جب کہ مسلمانوں کے یہاں شعور کے درجہ میں بھی عالمی تبلیغ کا کوئی حقیقی خاکہ موجود نہیں۔

اٹلی کی ایک خاتون ہیں۔ وہ ایک مسیحی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ پھر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور ایک عرب نوجوان سے نکاح کر لیا۔ ان کے عرب شوہر سے میری ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی اہلیہ اطالوی زبان کے علاوہ انگریزی زبان بھی بخوبی جانتی ہیں اور اب انھوں نے عربی بھی سیکھ لی ہے۔ عرب نوجوان نے بتایا کہ انھوں نے اطالوی خاتون کو انگریزی الرسالہ کے کچھ شمارے پڑھنے کے لئے دئے۔ ان کو پڑھ کر وہ کافی متاثر ہوئیں۔ اس کے بعد انھیں اسلامی دعوت کے بارے میں اپنی مسئولیت کا احساس ہوا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کا اسلوب عصری اسلوب ہے۔ وہ یورپی ذہن کو اپیل کرتا ہے اور دل کی گہرائی تک اتر جاتا ہے۔ میں ان مضامین سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔

ان کو پڑھ کر میں اپنی زندگی میں پہلی بار روئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو اسی طرح پیش کرنا چاہئے:

إنّ هٰذا الاسلوب اسلوب عصری یخاطب العقلیة الادبیة وینفذ الی اعماق القلب انی تاثرت جدا بهٰذه المقالات وبکیت لاول مرة۔ هٰکذا یجب أن یقدّم الاسلام

ملاقاتوں کے بعد اکثر ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مرکز کا پیغام ایسے ایسے مقامات پر پہنچ رہا ہے جن کی بابت ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مثلاً سفر کے دوران ڈنمارک کے ایک صاحب ملے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے آپ کا انگریزی الرسالہ اور انگریزی کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ ہمارے سنٹر کی لائبریری میں موجود ہیں۔ اور لوگ ان کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کا نام اور پتہ یہ ہے:

Sheikh Mohammed Idris, Islamic Cultural Centre,
Morsebakken 2, Copenhagen 2400 NV (Tel. 01609017)

روم کے تاریخی مقامات کو دیکھنے کے بعد دوبارہ ہم روم ایئرپورٹ پر واپس آگئے۔ یہاں ایئرپورٹ لاونج میں سنڈے ٹیلی گراف (۶ اکتوبر ۱۹۹۱) دیکھا۔ اس کے صفحہ ۲۶ پر ایک کالم ویٹیکنالوجی (Vaticanology) کا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اٹلی اور انگلستان کے سفیر سے ملاقات کرتے ہوئے پوپ جان پال دوم (Pope John Paul II) نے چرچ کی طرف سے تشدد اور تخویف کے تمام اعمال کی ان الفاظ میں مذمت کی:

The Church continues to condemn all acts of violence and intimidation, from whatever source they originate.

قدیم زمانہ میں ممکن تھا کہ تشدد کو صرف ظالم اور مفسد کے خلاف استعمال کیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں ٹکنکل ترقیوں نے اس کو ناممکن بنا دیا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کے دور میں تشدد ایک ایسا مہلک عمل بن چکا ہے جو فاتح اور مفتوح دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔ حتی کہ وہ خود زمین کو ناقابل رہائش بنا دینے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روس اور امریکہ اپنے ہتھیاروں کو فنا کرنے کے معاہدے کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جو مسلمان تشدد اور مسلح انقلاب کی بات کرتے ہیں وہ ایک قسم کی خلاف زمانہ حرکت (anachronism) میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلام کو بھی وہیں پہنچا دینا چاہتے ہیں جہاں وہ خود اپنی فکری

پسماندگی کی بنا پر کھڑے ہوتے ہیں۔

روم سے مالٹا کے لئے الیٹالیا کی فلائٹ ۴۹۰ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کے اندر الیٹالیا کا میگزین (Arrivederci) دیکھا۔ اس کے ایک صفحہ پر اٹلی کے ایک خوبصورت مکان کی رنگین تصویر تھی جس کے ساتھ خوبصورت ترگارڈن بھی شامل تھا۔ اس پرکشش تصویر کو دیکھ کر میری زبان سے نکلا: دنیا جنت کی ناقص تصویر ہے اور جنت اس کی کامل تصویر۔ دنیا اِن کمپلیٹ ہے اور جنت کمپلیٹ۔

روم سے روانگی کا وقت ایک بج کر ۴۵ منٹ تھا۔ مگر روانگی میں آدھ گھنٹہ کی تاخیر ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخر وقت میں معلوم ہوا کہ جہاز کے نظام میں کوئی تکنکل خرابی پیدا ہوگئی ہے۔ فوراً انجنیر بلایا گیا۔ دو آدمی دیر تک کام کرتے رہے۔ جب نظام کی اصلاح ہوگئی، اس کے بعد جہاز روانہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ جہاز کے فنی نظام میں خرابی کا علم پرواز سے پہلے ہونا اور اس کا علم پرواز کے دوران ہونا دونوں میں لفظی طور پر بہت کم فرق ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرواز سے پہلے اس کا علم ہونا اگر زندگی ہے تو پرواز کے دوران اس کا علم ہونا موت۔

یہی معاملہ قوموں کا ہے۔ جس قوم کے لیڈر اقدام سے پہلے قوم کی کمیوں کو جان لیں وہ قوم کو زندگی کی نعمت عطا کرتے ہیں۔ اور جس قوم کے لیڈر اقدام کے بعد قوم کی کمیوں اور کمزوریوں کو جانیں وہ قوم کو صرف ہلاکت کے گڑھے میں گرانے کا سبب بنتے ہیں۔

روم اور مالٹا کے درمیان سسلی واقع ہے۔ مالٹا جاتے ہوئے ہم جزائر سسلی کے اوپر سے گزرے۔ جہاز کی کھڑکی سے وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ چنانچہ میں اس کو دیر تک دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ ہمارے اسلاف جزائر سسلی میں اترے اور اس کو تہذیب و تمدن کی ترقیاں عطا کیں۔ میرے لئے صرف یہ مقدر تھا کہ میں اس کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے گزروں۔ کیسا عجیب فرق ہے ماضی اور حال میں۔

سسلی میڈیٹرینین کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اس وقت وہ اٹلی کا ایک حصہ ہے۔ قدیم زمانہ میں سسلی مختلف قوموں کے ماتحت رہا ہے۔ لندن کی چھپی ہوئی ایک قدیم انسائیکلوپیڈیا (The Book of Knowledge) میں یہ الفاظ درج ہیں کہ نویں صدی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سسلی عرب کلچر اور عرب علم کا مرکز بن گیا تھا۔ نارمنوں نے ان کو گیارھویں صدی میں یہاں سے

نکال دیا:

The arrival of the Saracens in the 9th century made Sicily a centre of Arab culture and learning. The Normans drove them out in the 11th century. (7/50)

سسلی (صقلیہ) نویں صدی میں مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ اس کے بعد وہ میڈیٹرینین میں مسلمانوں کی توسیعی مہموں کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ نارمن نے ۱۰۹۱ میں جزیرہ کے اندر اپنا اقتدار قائم کرلیا:

With the Muslim conquest of Sicily (9th century), the island became the chief base of Arab expansion in the Mediterranean until the Normans imposed their authority in 1091. (V/470,9/932)

تاریخ کے ان واقعات میں بے پناہ سبق ہے۔ یہ واقعات ہمیں اپنی کمزوریوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخی کتابیں ان واقعات کو صحیح انداز میں پیش نہیں کرتیں۔ اس لئے ان کو پڑھ کر بھی مسلمان ان سے صحیح سبق نہیں لے پاتے۔

مثال کے طور پر ابن اثیر کی الکامل فی التاریخ کا ایک باب ہے: جزیرہ صقلیہ پر فرنگیوں کے اقتدار کا ذکر (ذکر ملك الفرنج جزیرة صقلیة) یہ باب ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

فی هذه السنة استولی الفرنج لعنهم الله علی جمیع جزیرة صقلیة اعادها الله الی الاسلام والمسلمین	اس سن (۴۸۴ھ) میں فرنگی پورے جزیرہ پر قابض ہوگئے، اللہ ان پر لعنت کرے اور اللہ اس کو دوبارہ اسلام اور مسلمانوں کی طرف لوٹا دے۔

(۱۰/۱۹۳)

سسلی پر "فرنگیوں" کا دوبارہ قبضہ، جیسا کہ خود ابن اثیر نے تفصیل سے لکھا ہے، خود مسلمانوں کی باہمی عداوتوں اور آپس کے قتل وخون کی وجہ سے ہوا۔ مگر جب آغاز بحث میں مذکورہ جملہ لکھ دیا جائے تو اس کے بعد سرے سے نصیحت کا ذہن ختم ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ تاریخ کے مطالعہ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے حال اور مستقبل کے لئے نصیحت حاصل کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو

مؤرخانہ انداز میں لکھنا چاہئے نہ کہ معتقدانہ انداز میں۔

میڈیٹرینین میں پیش قدمی کے زمانہ میں سسلی مسلمانوں کے لئے رسد گاہ کا کام کرتا تھا۔ قدیم زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو کافی ترقی بھی دی تھی۔ سسلی پر عرب تہذیب کی اتنی گہری چھاپ تھی کہ عربوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی سسلی کے امراء اور سلاطین عرب طرز پر رہتے تھے اور عربوں جیسا لباس پہنتے تھے، جس طرح موجودہ زمانہ میں برٹش راج سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود قدیم برطانوی ممالک برطانوی لباس اور برطانوی زبان کو فخر کے ساتھ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال نے سسلی کی بابت کہا تھا:

رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

مگر سسلی کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ موجودہ زمانہ میں مواصلاتی ذرائع کی ترقی نے ہمارے لئے دعوت کے مواقع کتنے زیادہ بڑھا دئے ہیں۔ ہمارے اسلاف نے "تہذیب حجازی" کو سسلی تک پہنچانے کے لئے برسوں کا دشوار گزار سفر طے کیا تھا۔ آج ہم صرف گھنٹوں کے اندر آسان سفر طے کرکے سسلی پہنچ سکتے ہیں اور وہاں کے باشندوں کو دوبارہ "تہذیب حجازی" کی تسخیری قوت سے مسخر کرسکتے ہیں۔ مگر اس کے لئے دعوتی شعور کی ضرورت ہے، اور دعوتی شعور موجودہ مسلمانوں میں سرے سے موجود نہیں۔

جزیرہ صقلیہ (سسلی) اور جنوبی اٹلی میں ایک عرصہ تک مسلمانوں کا غلبہ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخ کی کتابوں میں کافی مواد موجود ہے۔ اس موضوع پر ۲۸۰ صفحات کی ایک عربی کتاب یہ ہے:

احمد توفیق المدنی، المسلمون فی جزیرۃ صقلیۃ وجنوب ایطالیا۔

مکتبۃ الاستقامۃ، تونس، ۱۹۴۶ء

اس کتاب کے صفحہ ۸۶ پر "فتح مالطۃ" کا عنوان ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ رومیوں نے ۵۳۳ء میں مالٹا پر قبضہ کر لیا تھا۔ ۸۷۰ء میں صقلیہ کے مسلم حکمراں نے اس کو اپنے زیر اقتدار لے لیا۔ جزیرہ پر ان کا یہ اقتدار ۱۰۹۰ء تک باقی رہا۔ اس طرح ۲۲۰ سال تک یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مالٹا کے لوگ محرف عربی بولتے ہیں۔

روم سے مالٹا تک کا پورا سفر میڈیٹرینین کے اوپر سے ہوا۔ سمندر بھی اسی طرح نیلا نظر آرہا

تھا جس طرح آسمان نیلا دکھائی دیتا ہے۔ حالاں کہ باعتبار حقیقت نہ سمندر نیلے رنگ کا ہے اور نہ آسمان نیلے رنگ کا۔

یہ صرف ایک گھنٹہ کا مختصر سفر تھا۔ ہم لوگ جہاز میں آکر بیٹھے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی چیزیں دیکھیں۔ اتنے میں ناشتہ آگیا۔ ناشتہ سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ "اپنی کرسی کی پیٹی باندھ لیں" کا اعلان ہونے لگا۔ پھر اعلان ہوا کہ ہم جلد ہی مالٹا کی زمین پر اترنے والے ہیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ سفر آدمی کی دنیوی زندگی کا ایک علامتی تعارف ہے۔ آدمی دنیا میں آتا ہے۔ وہ بچہ سے بڑا ہوتا ہے۔ تعلیم حاصل کرتا ہے۔ کمانے اور دنیا کی تعمیر کے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ وہ اپنا گھر بناتا ہے۔ ابھی اس کے گھر کی دیواروں کی پینٹنگ ہو رہی ہوتی ہے کہ "کوس رحلت بکوفت دست اجل" کا وقت آجاتا ہے۔ دنیا میں زندگی کا لمحہ کتنا مختصر ہے۔ اور کتنی لمبی مدت تک اس مختصر لمحہ کی قیمت انسان کو ادا کرنا ہے۔

۷ اکتوبر کی شام کو ہم مالٹا ایر پورٹ پر اتر گئے۔ جہاز سے باہر نکلے تو وہاں کانفرنس کے نمائندے ہماری رہنمائی کے لئے موجود تھے۔ انھوں نے ہم کو ایئر پورٹ کے لاونج میں بٹھادیا۔ ہمارے پاس مالٹا کا ویزا نہیں تھا۔ اس لئے یہاں ویزا ابھی لینا تھا۔ ان لوگوں نے ہمارا پاسپورٹ لیا اور اس کے بعد ویزا کا اندراج اور دوسری ضروری کارروائیوں کے لئے وہ ہمارا بدل بن گئے۔

یہ بظاہر سادہ سی بات ہے۔ ہر کانفرنس میں اسی طرح مہمانوں کی آمد پر ان کا استقبال اور ان کا تعاون کیا جاتا ہے۔ مگر میرا ذہن یہ سوچنے لگا کہ ایسا کس طرح ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ایسا ممکن نہیں تھا کہ ایک شخص ہندستان سے روانہ ہو اور لمبی مدت طے کرنے کے بعد جب وہ مالٹا پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو ہر چیز کی مکمل اطلاع ہو اور وہ عین وقت پر اس کی مدد کے لئے وہاں موجود ہوں۔ مگر آج جب ایک شخص غیر ملک میں اترتا ہے تو وہاں اس کے میزبان کو آمد کا وقت اور تاریخ اور سواری وغیرہ کی اطلاعات انتہائی صحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہیں۔

یہ "معجزہ" مواصلات (کمیونیکیشن) کی ترقی کے ذریعہ ممکن ہوا ہے۔ جدید مواصلات اللہ تعالیٰ کی عجیب نعمت ہیں۔ وہ خدا کی قدرت کو یاد دلاتے ہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ بیرونی دنیا کے سفر کرتے ہیں تو وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ میں فلاں مقام پر پہنچا تو وہاں اتنے آدمی میرے استقبال کے

لئے موجود تھے۔ ایک واقعہ جس کو حقیقۃً خدا کی گلوری کے خانہ میں ڈالنا چاہئے اس کو وہ ذاتی گلوری کے خانہ میں ڈال دیتے ہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے آپ کو جانیں مگر وہ خداوند ذوالجلال کے بارہ میں بے خبر ہوں۔

میں مالٹا ایرپورٹ کے وی آئی پی لاونج میں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک خوش پوش نوجوان آئے اور میری کرسی کے قریب فرش پر عقیدت مندانہ انداز میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنا نام مارکونی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب گاڈ ارائزز اور دوسری کئی انگریزی کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کتابوں نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ روم اور مالٹا میں بہت سے لوگ ہمارے مشن سے واقف ہیں اور ہماری کتابیں پڑھ چکے ہیں۔ اس علاقہ میں الرسالہ مشن کو متعارف کرانے میں الجزائر یونیورسٹی کے استاد دکتور محمد السلیمانی کا بہت بڑا دخل ہے۔ وہ عربی کے علاوہ فرانسیسی اور اطالوی زبانیں جانتے ہیں۔

کانفرنس کے منتظمین کا ہر کام اتنی منصوبہ بندی کے ساتھ ہو رہا ہے کہ ہم جب مالٹا ایرپورٹ پر پہنچے تو اسی وقت ہم کو کانفرنس کا بیگ، اس سے متعلق ضروری کاغذات اور مالٹا کے بارہ میں تعارفی لٹریچر سب کچھ ایرپورٹ پر ہی دے دیا گیا۔

مالٹا میں میرا قیام ہالی ڈے ان کے کمرہ نمبر ۲۰۱ میں تھا۔ مالٹا میں اہل اسلام کی ۲۲۰ سال تک حکومت تھی۔ یہاں کی زبان اور تہذیب پر عربوں کا غیر معمولی اثر ہے۔ مالٹی زبان میں پچاس فیصد سے زیادہ الفاظ عربی کے ہیں۔ اس کے بعد اطالوی اور انگریزی کے۔ مگر آج مالٹا مسلمانوں سے خالی ہے۔ عربی میں بطور مثل کہا جاتا ہے کہ ——— فلان کمن یوذن فی مالطا یعنی فلاں شخص مالٹا میں اذان دے رہا ہے جہاں کوئی نماز پڑھنے والا نہیں۔

تاہم یہ مثل مجھے پسند نہیں آئی۔ اس میں دعوتی شعور کا فقدان نظر آتا ہے۔ ایک عرب عالم سے میں نے کہا کہ اذان کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ دعوتی معنوں میں اس کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے۔ اذان میں حی علی الصلاۃ بھی کہا جاتا ہے اور حی علی الفلاح بھی۔ ایک کلمہ کا تعلق اگر ایمان قبول کرنے والوں سے ہے تو دوسرے کا تعلق ان لوگوں سے ہے جنھوں نے ابھی ایمان قبول نہیں کیا۔ مسلمان ایک اذان سے واقف ہیں، مگر وہ دوسری اذان سے واقف نہیں۔

۱ نیویارک کے حلقہ الرسالہ نے رمضان کے موقع پر آٹھ صفحہ کا ایک انگریزی پمفلٹ شائع کیا اور اس کو لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس پمفلٹ میں انگریزی الرسالہ کے روزہ سے متعلق چار مضامین شامل کئے گئے تھے۔ آخر میں "اے ریڈرز ویو آف الرسالہ" کے زیر عنوان مسٹر ایم ٹی خان، پٹنہ کا ایک مطبوعہ انگریزی خط نقل کیا گیا ہے۔

۲ ڈاکٹر عبد القیوم صاحب روم (اٹلی) میں رہتے ہیں۔ انھوں نے الرسالہ انگریزی کی ایجنسی لی ہے۔ اور اس کو روم کے انگریزی داں حلقہ میں پھیلا رہے ہیں۔

۳ بیت الحکمت (کراچی) سے رسائل و اخبارات کی ڈائرکٹری شائع کی گئی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۴ پر الرسالہ (نئی دہلی) کا اندراج ہے اور اس کے تحت یہ الفاظ ہیں: الرسالہ میں اسلامی حکایتیں اور واقعات کی تشریح بالکل نئے انداز میں پیش کی جاتی ہے۔

۴ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں ۴۲ سالہ کاروباری آدمی ہوں۔ آپ کے الرسالہ کا مستقل قاری ہوں۔ ہر ماہ ایک سو کاپیاں اور کبھی ۱۰۰ - ۲۰۰ زیادہ کاپیاں حاصل کرتا ہوں جن کو میں اپنی برادری اور دوستوں میں مفت تقسیم کرتا ہوں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے درمیان ایسا اعلیٰ دماغ پیدا کیا جو صرف دین کے کاموں میں استعمال ہو رہا ہے (احمد کمال کرانی، کراچی)

۵ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں چند سال سے الرسالہ کا قاری ہوں۔ اب میں چھ الرسالہ کی ایجنسی چلا رہا ہوں اور ان کو تعلیم یافتہ طبقہ میں تقسیم کرتا ہوں۔ تین سال قبل ہم دو آدمی تھے اب الحمد للہ دس افراد یہاں الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور وہ آگے اپنے احباب کو پڑھا رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایک مشکل مقام پر تھا جہاں مجھے دینی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ قریب تھا کہ میں ہلاکت میں جا گرتا۔ اس وقت ایک صاحب خضر بن کر میری دنیا میں آئے۔ انھوں نے مجھے الرسالہ مشن سے متعارف کرایا۔ الحمد للہ الرسالہ کے مثبت انداز فکر نے مجھے بربادی سے بچا لیا۔ الرسالہ کی تمام مطبوعات حاصل کر لی ہیں اور ان کو پڑھ رہا ہوں۔ میرا تعلق پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن سے بھی ہے اور میرے توسط سے بہت سارے ڈاکٹر

صاحبان اس مشن سے متعارف ہو چکے ہیں اور ان کی طلب میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔
(ڈاکٹر حافظ نثار احمد، صادق آباد، پاکستان)

۶ ہارون بھائی ہوزری والے (بمبئی) نے اپنی طرف سے زر تعاون ادا کر کے ایک سو اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کے نام الرسالہ اردو اور انگریزی جاری کروایا ہے۔ جو لوگ اس طرح الرسالہ کے پیغام حق کی اشاعت میں تعاون کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

۷ ڈاکٹر سلطان احمد صاحب (بنگلور) ہر ماہ الرسالہ کی کئی کاپیاں لے کر لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ الرسالہ مارچ ۱۹۹۲ (روزہ نمبر) کی مزید تعداد حاصل کر کے انھوں نے بہت سے لوگوں تک پہنچایا۔ اسی طرح اسلامی مرکز کی انگریزی مطبوعات وہ غیر مسلم صاحبان تک پہنچا رہے ہیں۔ مختلف مقامات پر اسی طرح لوگ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ کی اشاعت میں تعاون کر رہے ہیں۔

۸ شیخ محمد سلیمان القائد نے الرسالہ مشن کی حمایت میں ۲۱۰ صفحات پر مشتمل ایک عربی کتاب لکھی ہے جو قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں کثرت سے مطبوعات الرسالہ کے حوالے شامل ہیں۔ اس کتاب پر مصر کے مشہور ادیب احمد بھجت نے ایک تعارفی مضمون لکھا ہے جو قاہرہ کے اخبار الاہرام (۲ مارچ ۱۹۹۲) میں ان کے مستقل کالم "صندوق الدنیا" کے تحت شائع ہوا ہے۔ احمد بھجت آخر میں لکھتے ہیں: والمفکر اللیبی محمد سلیمان القائد من تلامیذ المفکر الھندی وحید الدین خان، وھو یناقش ھذہ القضایا بفکر واضح ومنطق سلیم وحجۃ قویۃ (صفحہ ۲)

۹ جگدیش سنگھ کالڑا ایڈوکیٹ (نئی دہلی) الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کا روزہ نمبر (مارچ ۱۹۹۲) پڑھ کر پہلی بار مجھ کو معلوم ہوا کہ روزہ کیا ہے اور وہ کیوں اتنا ضروری ہے۔

۱ اس سے پہلے میں نے اسلامی عبادات پر بہت کچھ پڑھا تھا مگر اب تک وہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، روزہ نمبر پڑھ کر پہلی بار اسلامی عبادت کی حقیقت سمجھ میں آئی۔

۱۰ ایک مشہور عربی درس گاہ کے طالب علم (محمد ابوبکر) لکھتے ہیں کہ جب میں نے آپ کے بھیجے ہوئے الرسالہ کو پایا تو مجھے جو خوشی ہوئی اس کو میں قلم بند نہیں کر سکتا۔ بے ساختہ میرے دل سے

یہی دعا نکلی کہ اللہ آپ کی حیات دراز کرے تاکہ ہم سب آپ کی کد و کاوش کے ثمرہ سے خوب سیراب و شبعان رہیں۔ آپ کے رسالہ سے مجھے جتنا فائدہ حاصل ہوتا ہے اتنا مجھے کسی اور پرچہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ میری اتنی استطاعت نہیں کہ میں آپ کے پرچہ کو خرید کر پڑھ سکوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہمارے لئے رسالہ عنایت کرتے رہیں اور اپنی دیگر مطبوعات سے بھی ہم طلبہ کی مدد کریں (مدارس عربیہ سے اس قسم کے خطوط ہم کو ملتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر کچھ لوگ مالی تعاون کریں وہ انشاء اللہ ان کے لئے باعث ثواب ہوگا)

۱۱ ایک صاحب لکھتے ہیں: عظمت صحابہؓ کے نام سے جو الرسالہ چھپا ہے، ضرورت ہے کہ وہ تمام لوگوں تک پہنچ جائے۔ اور وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ صحابہ کیسے تھے اور انھوں نے کیا صحیح راستہ ہمارے سامنے رکھا ہے۔ آپ نے اس میں صحابہ کی زندگی کو نہایت صحیح طریقہ سے واضح کیا ہے۔ دوسرے لوگ بھی صحابہ کا بیان کرتے ہیں مگر اس طرح نہیں کہ وہ ہمارے لئے کس طرح مشعل راہ ہیں (عبدالمجید بٹ، کشمیر)

۱۲ ایک صاحب لکھتے ہیں: میں نے تذکیر القرآن کا مطالعہ کیا۔ مجھے حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ ایسی جامع تفسیر اور سہل ترمعانی اور بہت جلد مطلب دماغ میں سما جانے والی کوئی اس طرح کی تفسیر اب تک میری زندگی میں نظر سے نہیں گزری۔ اور عقلیات اسلام اور اللہ اکبر، ان دونوں کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ واقعی اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اب تقریر سننے کے لئے کیسٹ کا انتظار ہے (محمد آزاد، کٹیہار)

۱۳ خاتون اسلام کا نیا اڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ زیر طبع ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی اب انشاء اللہ آخری مرحلہ میں ہے۔

۱۴ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر نشر کی گئی۔ یہ تقریر ۱۵ اپریل ۱۹۹۲ کو نشر ہوئی اور اس کا موضوع عید الفطر تھا۔ اس میں عید الفطر کی مذہبی اور سماجی اہمیت بتائی گئی۔

۱۵ سیرت رسول پر سادہ واقعاتی انداز میں ایک کتاب تیار ہو رہی ہے۔ غزوۂ بدر تک اس کی تحریر اور کتابت ہو چکی ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرتعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زرتعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے ناٹس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

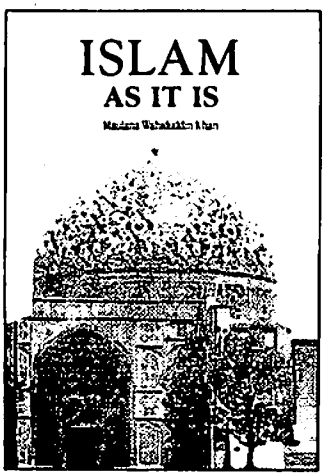

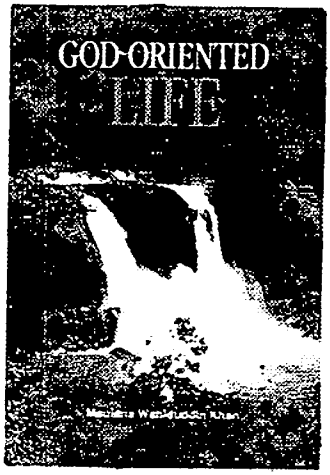

ISLAM AS IT IS

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 114 Rs. 40

In *Islam As It Is,* Maulana Wahiduddin Khan presents the fundamental teachings of Islam in a manner which will appeal directly to both general readers and students of Islam.

Simple and straightforward in style, *Islam As It Is* gives the reader an accurate and comprehensive picture of Islam — the true religion of submission to God.

GOD-ORIENTED LIFE

By Maulana Wahiduddin Khan

Pages 186 Rs. 60

The traditions – Sunnah – of the Prophet Muhammad, upon whom be peace, and the lives of his companions and those closely associated with them, serve as a major source of religious enlightenment in theory and in practice. This book endeavours to present these ideas in the simplest and most direct way. In that it culls from authentic sources the sayings and deeds of the Prophet and those inspired by him, it brings to us a complete and, above all, human picture of true Islamic behaviour.

الرسالہ بک سنٹر

اردو، ہندی، انگریزی اور عربی میں ملک اور بیرونِ ملک
کی چھپی ہوئی دینی، علمی اور ادبی کتابوں کا عظیم مرکز

- قرآن • حدیث • تفسیر • سیرت وسوانح • فقہ وقانون
- عقائد • دعوت وتبلیغ • تاریخ • اسلامی تحریک • اخلاقیات
- خواتین اور بچّوں کے لیے دینی اور اصلاحی کتابیں • ڈکشنریاں اور علمی مراجع
- پاکستان کی چھپی ہوئی علمی، ادبی اور دینی کتابیں • سیاست
- قاہرہ اور بیروت کی چھپی ہوئی عربی کتابیں • اسلامی معاشیات
- اردو، فارسی اور عربی ادبیات پر معیاری کتابیں • ثقافت اور تعلیم
- اسلامی مجلّات ورسائل • دیگر ادیان ومذاہب کی بنیادی کتابیں
- زندگی کی تعمیر اور اصلاحِ انسانیت سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ کتابیں
- اسلامی موضوعات پر آڈیو اور ویڈیو کیسٹ • طغرے اور عید کارڈ وغیرہ

نمبر ۱ نظام الدین ویسٹ مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
فون: ۶۱۱۱۲۸، ۶۹۷۳۳۳

Single Copy Rs. 5 □ Annual Subscription Rs 60/$25